بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو نثر پر

سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔اردو (ریگولر)

۲۰۰۸ء

مقالہ نگار

بشیر احمد

لیکچرر شعبۂ اردو

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، تلہ گنگ

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

پروفیسر شعبۂ اردو

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

فہرست

پیش لفظ ۱

باب اول

سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر ۵

باب دوم

ناول پر اثرات ۳۹

باب سوم

افسانے پر اثرات ۷۷

باب چہارم

دیگر اصنافِ نثر پر اثرات ۱۱۴

باب پنجم

ماحصل ۱۶۲

کتابیات ۱۹۵

پیش لفظ

میں پی ایچ۔ڈی کے مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس کی عنایات کے سبب یہ ممکن ہوا۔ پی ایچ۔ڈی میں داخلے اور ابتدائی کورسز کی تکمیل کے بعد مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب ایک اہم مرحلہ تھا۔ اِس موقع پر میں نے اپنے استادِ محترم کی مرضی اور مشورے سے"اردو ادب پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات"کے موضوع پر خاکہ و کتابیات تیار کر کے منظوری کے لیے یونیورسٹی میں جمع کرائے تاہم یونیورسٹی کے مختلف اجلاسوں میں ''اردو نثر پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات'' کا موضوع منظور کیا گیا۔ اِس موضوع پر جیسے جیسے میرا مطالعہ بڑھتا گیا ویسے ویسے میری دلچسپی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان ایک خاص نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس امر کی ضرورت تھی کہ ملک کا ہر شہری اس نظریے کی حفاظت کرتے ہوئے ملک کی بنیادوں کو مضبوط بناتا۔ ذاتی مفاد پر ملکی اور قومی مفاد کو ترجیح دی جاتی اور ملکی آئین کی پاسداری کی جاتی۔ پاکستان ایسے دو حصوں پر مشتمل تھا جن کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ اس صورت میں ملک کو متحد رکھنے اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے گہری بصیرت کی ضرورت تھی مگر بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے تھوڑے عرصے بعد ہی ہم اپنا راستہ بھول کر منزل سے بھٹک گئے۔ ملکی مفاد پر ذاتی مفاد نے فوقیت حاصل کر لی، آئین اور قانون کی اہمیت ختم ہو گئی اور پاکستانی معاشرہ ایک ایسی ڈگر پر چل نکلا جس میں اجتماعی سوچ اور قومی فلاح و بہبود کا تصور موہوم ہوتا چلا گیا۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس وقت سامنے آیا جب پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

پاکستان کا دولخت ہونا، ایسا معمولی واقعہ نہ تھا، جو ایک دن میں رونما ہو گیا بلکہ اس کے پیچھے برسوں پر پھیلی ہماری نااہلیاں اور دشمن کی سازشیں چھپی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی حالات اس ڈگر پر رواں ہو گئے کہ جن کا منطقی نتیجہ المیۂ مشرقی پاکستان کی صورت میں سامنے آنا ناگزیر تھا۔ یوں تو ہر محبِ وطن پاکستانی کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی بساط کے مطابق ان حالات کے تدارک کی کوشش کرتا مگر اس ضمن میں سب سے زیادہ ذمہ داری ادیبوں پر پڑتی تھی۔ ہم نے اس مقالے میں اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے ان حالات میں کس حد تک اپنی ذمہ داریوں کا احساس

کیا۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ادیب، جو اپنی سوچ اور فکر کے ذریعے معاشرے کا رخ متعین کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، لوگوں کے اندر قومی جذبہ اور اجتماعی سوچ پروان چڑھانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے؟ وہ پاکستان کی سالمیت کی طرف بڑھتے خطرات بھانپ کر لوگوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟ لوگوں کے اندر پاکستانی قومیت کا شعور اجاگر کرنے اور قومی وقار کا احساس پیدا کرنے میں انھوں نے کس قدر مساعی کیں؟ سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے بعد ہماری قوم کا ہر فرد گہرے دکھ میں ڈوب گیا اور اسے شدید قومی ہزیمت کا احساس ہوا۔ ایسے حالات میں ادیبوں کا فرض تھا کہ وہ اس شکست خوردہ قوم کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور آگے بڑھنے کے جذبات پروان چڑھاتے۔ پچھلی غلطیوں کا احساس اجاگر کرتے ہوئے قوم کے اندر نئی روح پھونکنے اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنے کا درس دینے کی ضرورت تھی تا کہ آئندہ اس نوع کے المیوں سے بچا جا سکے۔ مجموعی طور پر اس مقالے میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر ہمارے ادیب اپنی ان ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو سکے ہیں؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے نثری ادب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں جغرافیائی، سیاسی، اقتصادی، لسانی، تعلیمی، علمی و ادبی، عسکری اور بین الاقوامی اثرات کے حوالے سے سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں قیامِ پاکستان سے سقوطِ ڈھاکہ تک کے ان حالات و واقعات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے جو اس سانحے کا باعث بنے۔ اتنے بڑے المیے کا باعث کوئی ایک سبب نہیں ہو سکتا اور نہ کسی ایک فرد کو اس عظیم سانحے کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی جڑیں تاریخ کے پچیس سالوں پر پھیلی نظر آتی ہیں۔ اس باب میں اِن وجوہات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو تاریخ کے طویل صفحات پر بکھری نظر آتی ہیں۔

دوسرے باب میں سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول اپنی فنی خوبیوں کے باعث یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک طویل اور ہمہ پہلو واقعے کو مختلف زاویوں سمیت اپنی گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ مقالے میں اس بات کا مطالعہ کیا گیا ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے اس عظیم قومی اور انسانی المیے کو کس کس انداز میں ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور وہ قاری کو پورے تاریخی پس منظر سمیت اس المیے سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو سکے ہیں یا نہیں؟ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ قومی سطح پر تو ایک عظیم المیہ تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر بھی اس المیے نے کئی انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان ناولوں میں اس بات کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے کہ ہمارے ناول نگار فسادات کے ان دنوں میں انسان کے کتنے پہلو دیکھنے اور انھیں قاری کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

تیسرا باب سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے جانے والے افسانوں کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے، اس بات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے یہ کہانیاں تحریر کرتے ہوئے کن کن پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھا ہے؟ وہ حالات کا غیر معروضی تجزیہ کرنے میں کس قدر کامیاب رہے ہیں اور مزید براں یہ کہ سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ گزرنے کے بعد اپنی قوم کے اندر قومی احساس پیدا کرنے اور اس کی تشکیلِ نو کرنے میں انھوں نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

چوتھے باب میں رپورتاژ، ڈائری، روداد، ناولٹ، ڈرامہ اور خطوط جیسی متفرق نثری اصناف پر اس المیے کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ سانحہ جس قدر ہمہ پہلو حیثیت کا حامل تھا، اسی طرح اس کے مختلف زاویوں کو اجاگر کرنے کے لیے ادیبوں نے مختلف اصناف کا سہارا لیا اور اس المیے کے مختلف پہلوؤں کو ادب کا حصہ بنایا۔ اس باب میں ان متفرق اصناف کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔

آخری باب میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے حوالے سے لکھی گئی مختلف نثری تحریروں کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اس سانحے کی شدت کو کس حد تک محسوس کیا؟ لاکھوں قربانیاں دے کر ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک کا محض چوبیس سال میں دو ٹکڑوں میں بٹ جانا اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کا ایک دوسرے پر مظالم کی انتہا کر دینا، کوئی ایسا معمولی واقعہ نہ تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ ہم نے اس باب میں اسی بات کا تعین کیا ہے کہ ادیب جو معاشرے کا سب سے حساس طبقہ کہلاتے ہیں، اس سانحے سے کس حد تک متاثر ہوئے؟ اور انھوں نے اپنی قومی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کیا کردار ادا کیا؟

مقالے کی تیاری میں کئی لوگوں کی مدد اور تعاون کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اس ضمن میں جناب مسعود مفتی، جناب سلیم منصور خالد، ڈاکٹر کنیز بتول، جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل اور احمد زین الدین کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے۔ جناب مسعود مفتی نے اس موضوع پر سب سے زیادہ تحریریں لکھی ہیں۔ انھوں نے میرے لیے اپنی یہ تحریریں تلاش کیں اور مجھے مہیا کیں۔ جناب سلیم منصور خالد مختلف اوقات میں مجھے درکار مواد ارسال کرتے رہے۔ ڈاکٹر کنیز بتول نے ڈھاکہ سے میرے لیے تحریریں اکٹھی کیں اور اپنے غیر مطبوعہ مقالے کا کچھ حصہ مجھے ارسال کیا۔ میں ان تمام صاحبان کا نہایت شکر گزار ہوں۔

میرے اس مقام تک پہنچنے میں سب سے بڑا کردار میرے اساتذہ کا ہے۔ میری خوش قسمتی رہی کہ مجھے زندگی میں اکثر اساتذہ کی شفقت اور محبت حاصل رہی ہے۔ میں اپنے تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں کہ میں آج جو کچھ ہوں، ان

کی عنایت کے سبب ہوں۔ اس موقع پر میں خاص طور پر اپنے استادِ محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو یاد کرنا چاہتا ہوں کہ جن کا میری تعمیر میں بہت حصہ ہے۔

میں استادِ محترم ڈاکٹر محمد سلیم ملک کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرا یہ مقالہ ان کی نوازشات کا مرہونِ منت ہے۔ خاکے کی تیاری سے مقالے کی تکمیل تک ہمیشہ مجھے ان کا تعاون حاصل رہا۔ اس مقالے میں جہاں کہیں بھی کوئی بات قابلِ تحسین ہے، یہ ان کی راہنمائی کے سبب ہے۔

مقالے کی تکمیل کے لیے گھر کے افراد کے تعاون کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس ضمن میں اپنے بھائی اور بیگم کا شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر مقالے کی بروقت تکمیل مشکلات کا شکار ہو سکتی تھی۔ میں اپنی بیٹی رانیہ احمد کے لیے دعا گو ہوں جس کی ہنسی زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجا لاتا ہوں جس نے مجھ پر اپنی عنایات کیں اور بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اس کی بے پایاں رحمت کا نتیجہ ہے کہ میں آج اپنا کام مکمل کر پایا ہوں۔

بشیر احمد

۶ نومبر ۲۰۰۸ء

باب اول

سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر

قائداعظم کی قیادت میں، قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران میں یوں تو ہندوستان کے تمام صوبوں کے مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا لیکن جن خطوں نے اس جدوجہد میں نسبتاً زیادہ سرگرمی اور جوش وخروش کا مظاہرہ کیا، ان میں بنگال سرِفہرست ہے۔ خطۂ بنگال کے باشندے طبعاً اور مزاجاً جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان میں بھی وہ ہراول دستے میں نظر آتے ہیں۔ دراصل انگریزوں اور ہندوؤں کے جبر اور ناانصافیوں کے سبب بنگال کے مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ سیاسی ومعاشی استحصال سے بچنے اور تہذیب وتمدن کی بقا کے لیے ہندوؤں سے علاحدہ خطۂ زمین کا حصول ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ۹۶ فی صد مسلمانوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ترجمان جماعت، مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی قربانیوں اور قائداعظم کی راہنمائی میں جب ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو خود مختار ریاستوں یعنی بھارت اور پاکستان کی صورت میں تقسیم ہوا تو پاکستان مسلم اکثریت کے دو صوبوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اور دوسرا مشرق میں واقع تھا ان دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کی جغرافیائی دوری تھی۔

ہندوؤں نے اپنی اجارہ داری اور برتری قائم رکھنے کے لیے قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی مگر جب ان کے عزائم کے برعکس پاکستان وجود میں آ گیا تو انھوں نے اس کے وجود کو دل سے تسلیم نہ کیا۔ وہ دھرتی ماتا کے تصور کے حوالے سے اس کی تقسیم کو ''مہاپاپ'' تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے انھوں نے پہلے دن سے پاکستان توڑنے کے لیے منظم سازشوں کا آغاز کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی حکمرانوں کے بعض فیصلوں اور دیگر عوامل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھیں اس مقصد کے لیے مشرقی پاکستان کی فضا زیادہ سازگار نظر آئی۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول:

> ''جب انھوں نے دیکھا کہ نامساعد حالات کے باوجود پاکستان اپنی بقاء واستحکام کی کوشش کر رہا ہے تو انھوں نے اسے ختم کرنے ...... کے لیے ایک منظم اور طویل المدت منصوبہ تیار کیا۔ بھارتی راہنماؤں نے پاکستان کے جغرافیائی، تہذیبی اور اقتصادی عوامل کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کا انتخاب کیا۔''[۱]

ہندوؤں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں کے لیے

نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں ہماری غلطیوں، کوتاہیوں اور اقتدار کی ہوس نے ان کا کام آسان بنا دیا۔ پاکستانی قومیت کی بنیاد مذہبی اقدار پر رکھی گئی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دینی جذبہ سرد پڑ گیا اس کی جگہ نسلی، لسانی، جغرافیائی، اقتصادی اور ثقافتی اختلافات ابھر کر سامنے آنے لگے۔ دشمن نے ان معاملات کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا جب کہ پاکستانی حکمرانوں نے ان مسائل پر توجہ دینے کی بجائے ان سے آنکھیں چرانے کا رویہ اختیار کیا اور نتیجۃً دونوں حصوں کے باسیوں کے درمیان نفرت کی دیواریں بڑھنا شروع ہو گئیں۔ نفرت کی یہ فصل ۱۹۷۱ء تک پوری طرح پک گئی اور آخر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا مشرقی حصہ، مغربی حصے سے کٹ کر ایک علاحدہ ملک ''بنگلہ دیش'' کی صورت میں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ سلیم منصور خالد اس المناک حادثے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بنگلہ دیش کا قیام کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ ہماری حماقتوں اور نااہلیوں سے لکھی ہوئی داستان کا المناک مگر منطقی انجام تھا۔''[۲]

سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے نے پوری پاکستانی قوم کو شدید احساسِ ذلت اور احساسِ شکست میں مبتلا کر دیا۔ بے شمار قربانیوں اور جدو جہد کے نتیجے میں حاصل کی گئی مملکتِ خداداد کا دو حصوں میں بٹ جانا معمولی واقعہ نہ تھا۔ ایک ہی قوم کے دو گروہوں کے درمیان علاقائی بنیادوں پر تضادات ابھرے اور ان تضادات نے ایسے ہمہ پہلو المیے کو جنم دیا جس سے محبِ وطن پاکستانوں کی قومی اور ذاتی زندگی براہِ راست متاثر ہوئی۔

سانحہ مشرقی پاکستان کا ایک بڑا سبب ملک کے دونوں حصوں کے درمیان جغرافیائی فاصلہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی نصیب ہوئی تو زمین کے دو ایسے ٹکڑوں پر مشتمل ایک ملک وجود میں آیا جس کے دونوں حصوں میں ایک ہزار میل کی دوری تھی اور درمیان میں ایسا ملک تھا جس نے پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہ کیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہوائی راستہ بھی دو گھنٹوں پر مشتمل تھا اور اس مقصد کے لیے بھی بھارت کی فضائی حدود میں سے گزر کر جانا پڑتا تھا جب کہ بحری راستہ مزید دشوار تھا اور اس کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ بھارت کے لیے کسی بھی وقت اس کی ناکہ بندی کرنا مشکل کام نہ تھا۔ ڈاکٹر صفدر محمود مشرقی پاکستان کی جغرافیائی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جغرافیائی لحاظ سے بھی مشرقی پاکستان کی حیثیت بڑی نازک تھی۔ اس کے اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا طویل بھارتی علاقہ حائل تھا۔ مشرقی پاکستان کا صوبہ تین اطراف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا تھا۔''[۳]

بھارت نے پاکستان کے دو حصوں میں جغرافیائی لحاظ سے اس قدر دوری کا فائدہ اٹھایا۔ جب مشرقی پاکستان کے حالات زیادہ بگڑنا شروع ہوئے تو ایک سازش کے تحت ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک بھارتی طیارہ اغوا کر کے لاہور پہنچا دیا گیا۔

اغوا کرنے والے دو کشمیری نوجوان ہاشم قریشی اور اشرف قریشی تھے۔ بھارت نے اس واقعہ کی آڑ میں اپنے علاقے پر سے گزرنے والی پاکستانی پروازیں بند کر دیں جس کی وجہ سے دونوں حصوں کے درمیان فضائی سفر دو گھنٹوں سے بڑھ کر چھے گھنٹے ہو گیا۔ جنگ کے دنوں میں مغربی پاکستان سے فوجی کمک، مشرقی پاکستان پہنچانا ممکن نہ رہا۔ یوں جغرافیائی لحاظ سے دونوں حصوں میں اس قدر دوری بھی اس سانحے کا سبب بنی۔

قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی میدان میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے، اس پر مارشل لاء نے ان کی سیاسی محرومی میں اضافہ کر دیا۔ سیاسی میدان میں زیادتی کا احساس تو اہلِ بنگال کو قیامِ پاکستان سے پہلے اس وقت ہوا جب ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات کے نتیجے میں سندھ اور بنگال میں مسلم لیگی وزارتیں قائم ہوئیں اور مرکز میں مخلوط حکومت قائم کی گئی۔ اس حکومت میں مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خان، آئی آئی چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خان اور جوگندر ناتھ منڈل شامل ہوئے۔ صوبہ بنگال کی نمائندگی کے لیے کسی معروف مسلم لیگی راہنما کی بجائے ایک غیر معروف اور اچھوت راہنما جوگندر ناتھ منڈل کی کابینہ میں شمولیت پر تنقید ہوئی۔ اس طرح ۳۱ مئی ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی تقسیم کا حتمی فارمولا مسلم لیگ، کانگریس اور سکھوں کے نمائندوں سے منظوری کے لیے لایا تو اس موقع پر بھی قائداعظم، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر اس اجلاس میں شامل ہوئے جب کہ بنگال سے کسی راہنما کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سہروردی کی بجائے خواجہ ناظم الدین کا بنگال میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے عہدے پر تقرر بھی پسند نہ کیا گیا۔ زاہد چوہدری اسے تحریکِ علاحدگی کا آغاز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اس تحریک (تحریکِ علاحدگی) کی بنیاد در اصل پاکستان کے قیام سے ہفتہ عشرہ قبل ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں رکھ دی گئی تھی جب کہ متحدہ بنگال کے وزیرِ اعلیٰ حسین شہید سہروردی کی بجائے خواجہ ناظم الدین کا مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد کے طور پر انتخاب ہوا تھا۔''[۱۲]

قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں ایسے حالات سامنے آئے جن کے سبب اس حکومت کی مقبولیت بڑھنے کی بجائے کم ہونے لگی۔ ان ہی دنوں چٹاگانگ، نواکھلی اور بعض دوسرے علاقوں میں سیلاب کے سبب غذائی قلت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ بنگال کے اکثر کلیدی عہدوں پر مغربی پاکستانی افسروں کی تعیناتی، اردو کو واحد قومی زبان قرار دینے کی کوششوں، مسلح افواج سمیت سرکاری ملازمتوں میں بنگالیوں کی کم نمائندگی اور جماعت کے اندرونی مسائل نے اس حکومت کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت یہ مسائل حل کرنے میں ناکام رہی جس کے سبب بنگال میں مسلم لیگ کی مقبولیت تیزی سے کم ہونے لگی اور پھر ۲۵ جون ۱۹۴۹ء کو ڈھاکہ میں

سرکاری مسلم لیگ کے مقابلے پر مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ کی بنیاد ڈال دی گئی۔ جس کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی، سیکرٹری شمس الحق اور جائنٹ سیکرٹری شیخ مجیب الرحمان کا انتخاب کیا گیا۔ زاہد چوہدری اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اب مولانا بھاشانی کی زیرِ صدارت عوامی مسلم لیگ کی تشکیل اس لحاظ سے بہت تاریخی اہمیت کی حامل تھی کہ اس سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ایک حلقے کی جانب سے اس مسلم لیگ کی منظم طریقے سے مخالفت کی ابتدا ہوئی تھی جس کے زیرِ قیادت اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تھی۔''۵

اکتوبر ۱۹۴۹ء کو مولانا بھاشانی کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا اور مشرقی پاکستان کے حقوق و مفادات کا پرچار کرنے والے اخبار ''پاکستان آبزرور'' کے مالک اور مشرقی پاکستان کے وزیرِ تجارت حمید الحق کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت تحقیقات شروع کر دی گئیں۔ قائداعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل بنے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزیرِ اعظم بن گئے اور گورنر جنرل کے عہدے پر غلام محمد کو فائز کر دیا گیا۔

۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا خاتمہ کر دیا۔ خواجہ ناظم الدین اعلیٰ ترین حکومتی عہدے پر فائز ہونے والے پہلے بنگالی تھے، چنانچہ ان کی وزارت کے خاتمے پر بنگالیوں نے غم و غصے کا اظہار کیا۔ صدیق سالک اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو پارلیمنٹ سے اعتماد (یا عدم اعتماد) کا ووٹ لیے بغیر موقوف کر دیا، اس سے بنگالی اور زیادہ ناراض ہو گئے انھوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔''۶

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے امریکہ میں مقیم پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرا کو وزیرِ اعظم بنا دیا۔ ان حالات میں بنگالی یہ خیال کرنے لگے کہ پاکستان کی سیاست اور حکومت میں ان کا کچھ حصہ نہیں۔ بنگالی تعداد میں مغربی پاکستانیوں سے اکثریت میں تھے۔ چنانچہ اقتدار میں ان کے نمائندوں کی خاطر خواہ شمولیت ان کا بنیادی حق تھا مگر اقتدار کے فیصلے تو عوام سے پوچھے بغیر مطلق العنان انداز میں کر دیے جاتے جس کے سبب بنگالیوں کے اندر حکومتی معاملات سے محرومی کے احساس نے جنم لیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود اس سیاسی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ان (خواجہ ناظم الدین) کے جانشین محمد علی بوگرہ تو مشرقی پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندے بھی نہیں تھے۔ اسی طرح دستور ساز اسمبلی کے مختلف بنگالی رکن یا تو مشرقی پاکستان کے باشندے

نہیں تھے یا پھر عوام سے اپنا رابطہ منقطع کر چکے تھے۔ بنگالیوں کے ذہنوں میں یہ یقین راسخ ہو چکا تھا کہ وہ ملکی معاملات میں کبھی بھی اپنا فیصلہ کن کردار ادا نہیں کر سکتے۔" ۷

اس عرصے میں پاکستان کی خالق جماعت، مسلم لیگ بھی مشرقی پاکستان میں اپنا اثر کھو چکی تھی۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول:

"باشعور نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی مقبولیت کا سورج غروب ہو رہا ہے...... اس کے لیڈروں کا عام رویہ تساہل پسندانہ، غیر جمہوری اور عام سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری تھا۔ اس کے سیاسی راہنما اور کارکن ایک دوسرے کے خلاف سازشوں اور گروہی جھگڑوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔" ۸

L.F. Rushbrook Williams بنگالیوں کے احساسِ محرومی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"East Pakistanis saw that the most important positions in administration as well as in industry, business and finance were being held by West Pakistan or those who had settled in West Pakistan or by non-Bangalis who had settled in East Pakistan...... Bangalis born in what had become East Pakistan played little part in the life of affairs in Pakistan at the national level." 9

اس سیاسی احساسِ محرومی کا نتیجہ ۸ مارچ ۱۹۵۴ء کو مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات کے وقت سامنے آیا۔ جب وہاں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے مقابلے پر متحدہ محاذ کی جگتو فرنٹ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ متحدہ محاذ کی جماعتوں نے اپنی انتخابی تحریک کا آغاز لسانی مسئلے پر شہید ہونے والے طلبا کے مزار پر سلامی سے کیا۔ مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے مشرقی پاکستان کے ساتھ روا رکھے گئے رویے کے باعث ان انتخابات میں قومی یکجہتی کے برعکس علاقائی تاثر ابھر کر سامنے آیا، نتیجتاً مسلم لیگ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول "مشرقی پاکستان میں سیاسی میدان میں سے مسلم لیگ کی رخصتی کے ساتھ ہی قومی یکجہتی کی آرزو موہوم ہو گئی۔" ۱۰ مسلم لیگ کی جگہ جن پارٹیوں نے کامیابی حاصل کی ان میں سے بیشتر علاقائی حیثیت کی حامل تھیں۔ متحدہ محاذ میں شامل ان جماعتوں نے صوبائی تعصب اور علاحدگی پسند رجحانات کو ہوا دی چناچہ صوبے میں بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق ابھر کر سامنے آ گئی۔ مشرقی پاکستان میں اے۔ کے۔ فضلِ حق کو وزیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد مرکزی حکومت نے ان کی حکومت پر غداری کے الزامات

لگا کر انہیں برطرف کر دیا اور مشرقی پاکستان میں گورنر راج نافذ کر دیا۔ مشرقی پاکستانیوں نے حکومت کے اس اقدام کو بھی بنگالی عوام کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔[۱۱] اگست ۱۹۵۵ء کو چوہدری محمد علی نے پاکستان کے چوتھے وزیراعظم کا منصب سنبھالا تو گورنر جنرل کے عہدے پر غلام محمد فائز تھے یعنی دونوں بڑے عہدوں پر فائز افراد میں سے کوئی بھی بنگالی نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال مشرقی پاکستان کے بڑھتے ہوئے احساس محرومی میں اضافے کا باعث بنی۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں سہروردی نے مرکزی حکومت سنبھالی تو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے راہنما عطاالرحمٰن نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ اس دور میں کسی حد تک مشرقی پاکستانیوں کی شکایات دور کرنے کی کوشش کی گئیں مگر اکتوبر ۱۹۵۷ء میں سہروردی کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ سہروردی کی اقتدار سے علاحدگی کو بھی بنگالیوں نے پسند نہ کیا کیونکہ ان کے دور میں بنگالیوں کی شکایات کے ازالے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو گورنر جنرل سکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا اپنے عہدے سے الگ ہو گئے اور جنرل ایوب خان نے مکمل اقتدار سنبھال لیا۔ چونکہ مسلح افواج میں بنگالیوں کی نمائندگی نہایت کم تھی اس لیے وہ محسوس کرنے لگے کہ فوجی انقلاب آنے سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے معروف اخبار نویس تفضل حسین مانک میاں کے بقول ''ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان ملکی انتظامیہ میں اپنا حصہ حاصل نہیں کر سکا اور آزادی کے فوائد سے محروم رہا''[۱۱] اس احساس سے اس کے اندر نفرت اور محرومی کے جذبات مزید شدت اختیار کرتے چلے گئے۔ حافظ تقی الدین اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> ''مشرقی پاکستان کے لوگ یہ محسوس کرنے لگ گئے کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر مغربی پاکستان کی فوج کی غلامی میں آ گئے ہیں۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خواہشات لوگوں کے ذہنوں میں پروان چڑھنا شروع ہو گئیں اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان پر ایک فوجی انقلاب جنرل ایوب کی زیرِ قیادت مسلط کر دیا گیا جس نے مشرقی پاکستان کے لوگوں میں احساسِ محرومی کو اور زیادہ گہرا کر دیا۔''[۱۲]

ایوب خان نے اپنے دورِ حکومت میں بنگالیوں کا احساسِ محرومی دور کرنے کی کوششیں کیں۔ مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کے فروغ اور روزگار کی دستیابی پر توجہ دی گئی اس کے باوجود عام بنگالی کا معیارِ زندگی بہتر نہ بن سکا اور وہاں کے لوگوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے حکمرانوں کے لیے جگہ پیدا نہ ہو سکی۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کے مشرقی پاکستان کے لوگوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور انھوں نے خود کو مغربی پاکستان سے الگ تھلگ اور بے یار و مددگار محسوس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں مجیب الرحمٰن نے مشہورِ زمانہ چھ نکات کا اعلان کر دیا جس کے مطابق مشرقی حصے کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان نکات میں مشرقی پاکستان کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم

کے علاوہ دو حصوں کی الگ الگ کرنسی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ دفاع اور امورِ خارجہ کے شعبوں کے علاوہ باقی تمام شعبوں کے اختیارات صوبوں کو سونپنے کا مطالبہ بھی ان نکات میں شامل تھا۔ ان نکات پر تبصرہ کرتے ہوئے جی۔ ڈبلیو۔ چوہدری لکھتے ہیں۔

''آج کی دنیا میں کہیں بھی ایسا وفاقی نظام موجود نہیں جہاں مرکز صرف دو اختیارات کا حامل ہو۔ مجیب کی سکیم کا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ مرکز کو دفاع اور امورِ خارجہ کے اختیارات تو دے دیے گئے مگر صرف انھیں دو اختیارات کے بروئے کار لانے کے لیے بھی ذرائع اور وسائل مہیا نہ کیے گئے..... مجیب کے چھے نکات علاحدگی کی دستاویز کے سوا کچھ نہ تھے۔'' [۱۳]

اس دوران ۱۹۶۷ء میں اگرتلہ سازش کیس منظرِ عام پر آیا۔ اس کیس کو جس انداز میں چلایا گیا اس سے مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں مجیب الرحمٰن کی محبت میں اضافہ ہو گیا اور وہ بنگالیوں کا ہیرو بن گیا۔ حالانکہ اس کیس میں مجیب الرحمٰن کو اپنے دیگر ساتھیوں سمیت وطن توڑنے کے واضح ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اور مرتضیٰ انجم کے بقول:

''دورانِ تفتیش اگرتلہ سازش کا جو ریکارڈ پکڑا گیا تھا اس میں مجوزہ بنگلہ دیش کے دستور کا طبع شدہ کتابچہ بھی موجود تھا۔ اس کے صفحہ اول پر بنگلہ دیش کا جھنڈا شائع کیا گیا تھا، وہی اب بنگلہ دیش کا قومی جھنڈا ہے۔'' [۱۴]

دریں اثنا ایوب خان کی حکومت کی مخالفت میں اٹھنے والی تحریک شدت اختیار کر گئی اور جنرل ایوب خان اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر کے خود مستعفی ہو گئے۔ یحییٰ خان نے حکومت سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۷۰ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ پورے ملک میں انتخابی سرگرمیاں جاری تھیں کہ مشرقی پاکستان کو سیلاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہاں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اس موقع پر مغربی پاکستانیوں کے خلاف الزامات عاید کرنا شروع کر دیے۔

''وہ (مجیب الرحمٰن) جس علاقے میں بھی جاتے وہاں مغربی پاکستان کی قیادت کو گالیاں دیتے اور یہ الزام لگاتے کہ اسلامی ممالک اور دنیا بھر سے متاثرینِ سیلاب کے لیے آنے والے سامان کو مغربی پاکستان والوں نے ایئر پورٹ پر روک رکھا ہے جب کہ قیمتی سامان خُرد بُرد کیا جا رہا ہے..... نفرت کی اس لہر نے آناً فاناً پورے مشرقی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔'' [۱۵]

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ملک کے دونوں حصوں میں انتخابات صوبائی تعصب کی اسی فضا میں اس طرح منعقد ہوئے کہ مشرقی پاکستان کی بڑی جماعت عوامی لیگ نے مغربی پاکستان میں کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا اور مغربی پاکستان کی بڑی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان سے کسی امیدوار کو نامزد نہ کیا۔

مجیب الرحمٰن کی طرف سے چلائی گئی انتخابی مہم پر بھارت اور مقامی ہندوؤں نے جی بھر کر سرمایہ لگایا اور مجیب الرحمٰن

نے ان عناصر کی دل جوئی کے لیے مغربی پاکستان کے خلاف جی بھر کر پروپیگنڈا کیا۔ L.F. Rushbrook Williams اس انتخابی مہم پر بھارتی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"The campaign conducted by Sheikh Mujibur Rahman and his Awami League followers in preparation for the 1970 elections was warmly supported from India, where his steady refusal to condemn Indian policies and actions which were reprobated throughout the rest of Paksitan were noted with satisfaction."[۱۶]

مغربی پاکستان کی جن جماعتوں نے مشرقی پاکستان سے اپنے امیدوار کھڑے کیے، ان میں سوائے نوابزادہ نصر اللہ خان کے ایک امیدوار کے کسی پارٹی کا کوئی امیدوار کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ انتخابات کے یہ نتائج دونوں صوبوں کے عوام کی مغائرت کی طرف واضح اشارہ کر رہے تھے۔

جنرل یحییٰ خان نے ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کو انتخابات میں کامیابی پر مبارک باد کے پیغامات ارسال کیے اور شیخ مجیب کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ ان حالات میں یحییٰ خان ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ پہنچے اور شیخ مجیب سے مذاکرات کیے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو بھٹو بھی ایک وفد کے ہمراہ ڈھاکہ پہنچے جہاں انھوں نے مجیب سے تین مختلف ملاقاتیں کیں۔ اس موقع پر بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی چنانچہ ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء کو اجلاس طلب کر لیا گیا مگر بعد میں بھٹو نے اجلاس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ یحییٰ خان نے بھٹو کو اجلاس میں شرکت پر آمادہ کرنے کی بجائے غیر دانش مندانہ رویہ اختیار کیا اور یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس سے مشرقی پاکستان کے عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ مغربی پاکستانی حکمران انھیں اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتے۔ اس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور وہاں کے حالات تلپٹ ہو کر رہ گئے۔ صفدر محمود اجلاس کے بار بار التوا اور اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے ردِ عمل کے طور پر مشرقی پاکستان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ قانون کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور امن وامان کا تصور ختم ہو گیا۔"[۱۷]

مجیب الرحمٰن نے اجلاس کے التوا کے خلاف احتجاج کے لیے ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کہ جس روز قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا۔ پورے مشرقی پاکستان میں یومِ سوگ اور فوج کے خلاف یومِ سیاہ منایا گیا۔ عوامی لیگ نے ریڈیو اور ٹی وی کو "بنگلہ دیش" کا ترانہ نشر کرنے کا حکم دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو پورے صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیا۔ پورے مشرقی پاکستان میں لوٹ مار انتہا کو پہنچ گئی۔ ہر طرف

خوف وہراس کی فضا تھی اور جگہ جگہ پاکستانی پرچم نذرِ آتش کیا جارہا تھا۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن نے متوازی حکومت کا اعلان کر کے لوگوں کو ٹیکس دینے سے منع کر دیا۔ تعلیمی ادارے اور دفاتر بند کر دیے گئے۔ کئی شہروں میں لوگوں نے پاکستان کا جھنڈا اتار کر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا دیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمٰن کی رہائش گاہ سمیت، سیکرٹریٹ اور دیگر کئی عمارتوں پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا کر یومِ مزاحمت منایا گیا۔ بریگیڈیئر عبدالرحمٰن صدیقی ان دنوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "At other public buildings, the Bangladesh flag flew alongside the national flag. All the major English and Bangali dailies come out with special Bangladesh suppliments hailing Mujib as a great leader. Pakistan's Image seemed rather blurred and undefined against the sharp and well defined contours of Bangladesh." ۱۸

روزنامہ ''دی پیپل'' کے دفتر میں مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کے جھنڈے کے سائے میں سلامی لی جس پر یہ عبارت تحریر تھی ''آج دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا ہے۔'' توصیف احمد خان ان دنوں کے حالات و واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''مشرقی پاکستان میں گھر گھر بنگلہ دیش کے پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔ مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف دشنام طرازی کی جا رہی تھی، قائداعظم کی تصاویر جلائی گئیں، مخالفین کو قتل کیا گیا اور غیر بنگالی لڑکیوں کو اکثر مقامات پر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ایک پاکستان کی بات کرتی تھیں۔ یہ دن اصل میں عوامی لیگیوں کے لیے یومِ مزاحمت تھا۔'' ۱۹

ان حالات میں جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ پہنچے اور شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی۔ ''شیخ مجیب الرحمٰن نے جنرل یحییٰ خان سے ملاقات کے دوران پہلی مرتبہ یہ تاثر دیا جیسے وہ صدرِ مملکت سے نہیں بلکہ کسی مہمان سے گفتگو کر رہے ہوں۔''۲۰ ان ملاقاتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ چنانچہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان واپس مغربی پاکستان آ گئے۔ اسی روز مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کا آغاز کر دیا گیا اور مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس آپریشن کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستانی افواج کے بارے میں جو تاثر ابھر کر سامنے آیا اس نے دونوں حصوں کے مابین فاصلوں کو مزید بڑھا دیا بلکہ ایک رائے کے مطابق تو ''اس حملے کا مقصد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان خلیج کو پاٹنا نہ تھا بلکہ اس خلیج

کومزید گہرا اور نا قابلِ عبور بنانا تھا۔"۲۱

۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان نے قوم سے خطاب کیا اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں اور عوامی لیگ پر پابندی لگا دی۔ اخبارات پر سنسر عاید کر دیا اور کہا کہ مجیب کو اپنی غلطی کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ مگر ان سارے اقدامات کے نتیجے میں بین الاقوامی پریس خصوصاً امریکی پریس میں پاکستان کی مخالفت میں اضافہ ہو گیا اور پاکستان کو ایسے ظالم ملک کے طور پر پیش کیا گیا جو اپنے ہی شہریوں پر ظلم ڈھا رہا ہو۔

> "After the Pakistan Army's brutal action of 25 March 1971 the American Press totally went over to the Bangladeshi side." ۲۲

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے اس فوجی آپریشن کے دوران بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا وہ بھی نہایت غیر دانشمندانہ تھا۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کی صبح ان نمائندوں کو جس انداز میں ملک سے باہر نکالا گیا حسن ظہیر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "On 27 March in the early morning, the foreign journalists were bundled into army trucks and under heavy armed guard taken to the airport. Their baggage and bodies were thoroughly searched there for written material and photographs, some of which were confiscated." ۲۳

صحافیوں سے کیے گئے اس سلوک کا نتیجہ بعد میں اس وقت پاکستان کو بھگتنا پڑا جب عالمی ذرائع ابلاغ پاکستان کی افواج کے خلاف اور مشرقی پاکستان کی آزادی کے حق میں جی بھر کر لکھنے لگے۔

> "The mindless handling of the world's powerful media was only slightly less catastrophic than the action itself. They did not forget or frogive this treatment and Pakistan's case suffered immensely in the world opinion-making forums for the next nine months." ۲۴

دوسری طرف مشرقی پاکستان کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں کرفیو لگا دیا، جلسے جلوسوں پر پابندی عاید کر دی اور لوگوں کو تھانوں میں ہتھیار جمع کرانے کا حکم دیدیا۔ مشرقی پاکستان میں باغیوں کے

خلاف آپریشن شروع کر دیا گیا۔عنایت اللہ کے بقول "پاک فوج کے ایک ٹینک کے پہلے گولے نے دوست اور دشمن کی تمیز ختم کر دی۔" [۲۵] اس آپریشن کے دوران بڑے پیمانے پر کاروائیوں کے ذریعے پاکستانی فوج نے باغیوں کو خاموش کرا دیا اور مشرقی پاکستان میں کچھ دنوں کے لیے سکون آ گیا۔مکتی باہنی کے غنڈے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے مگر اس فوجی کاروائی کے دوران بدقسمتی سے فوجیوں سے بعض غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، دشمن نے ان غلطیوں کو بڑے پیمانے پر اچھالا اور پاکستانی فوج کے خلاف اس طرح کا پروپیگنڈا کیا کہ جیسے دشمن ملک کی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔گو کہ باغیوں کی کاروائیاں روکنے کے لیے یہ فوجی کاروائی ناگزیر ہو چکی تھی مگر اس کے نتائج حکمرانوں کی توقعات کے برعکس سامنے آئے۔ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول:

> "مشرقی پاکستان میں فوجی حکومت کی یہ کاروائی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئی۔اس کاروائی کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں موجود پاکستان کے حامی عناصر نے بھی معاندانہ رویہ اختیار کر لیا اور دنیا بھر میں پاکستان کے وقار کو شدید دھچکا لگا۔یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ فوجی کاروائی کے ذریعے پاکستان کی وحدت کا تحفظ ممکن ہو سکے گا، مگر اس کے برعکس یہ کاروائی متحدہ پاکستان کے خاتمے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔" [۲۶]

فوجی کاروائی کے نتیجے میں پُرسکون ہونے والے حالات عارضی ثابت ہوئے، کچھ ہی عرصے بعد حالات کی کشیدگی ایک بار پھر ابھر کر سامنے آنے لگی جس نے آخرِ کار ملکی سالمیت کو پارا پارا کر دیا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان علاحدگی کا ایک سبب اقتصادی میدان میں دونوں حصوں کے درمیان واضح فرق تھا۔یہ معاشی و اقتصادی تضاد لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں غربت بڑھتی گئی۔مشرقی پاکستانی اپنی اس غربت کا ذمہ دار مغربی پاکستان کو گردانتے تھے جس کے سبب اُن کے دلوں میں نفرت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں خطۂ بنگال زرعی معیشت کے اعتبار سے نہ صرف خود کفیل تھا بلکہ زائد دولت بھی پیدا کرنے کے قابل تھا۔مغل سلطنت کے مرکزی خزانے میں سب سے زیادہ ریونیو بنگال سے جاتا تھا مگر بعد کے ادوار میں مختلف بیرونی قوتوں نے یہاں کی دولت کو باہر منتقل کرنا شروع کر دیا جس کے سبب بنگال کی غربت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔زاہد چوہدری کا کہنا ہے کہ "برطانوی استعماریوں اور راجستھانی مارواڑیوں نے اس خطہ کی دولت کو بے دریغ لوٹا اور یہاں سے سرمایہ مسلسل باہر منتقل کیا جس کی وجہ سے یہ خطہ قحط زدہ اور مفلوک الحال نظر آنے لگا۔" [۲۷] قیامِ پاکستان سے پہلے مشرقی پاکستان کی اقتصادی زندگی پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔کارخانوں اور صنعتوں کے زیادہ تر مالک ہندو تھے اور مسلمان ان کے ماتحت صرف مزدوری اور کاریگر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔تقسیم ہندوستان کے بعد بھی ہندو تاجروں اور کارخانہ داروں کی بڑی تعداد بدستور وہاں موجود رہی جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔

مغربی پاکستان سے تو ہندو ۱۹۴۷ء میں بھارت چلے گئے مگر مشرقی پاکستان سے وہاں کے باشندے نہ نکلے اور تجارتی اور ثقافتی اداروں پر ان کا قبضہ رہا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کا خیال تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی حالت سدھر جائے گی مگر جب ایسا نہ ہو سکا اور ان کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو ان کے دلوں سے پاکستان سے محبت کا جذبہ ماند پڑنے لگا۔

اقتصادی میدان میں مشرقی پاکستان کی پسماندگی کی وجہ غلط منصوبہ بندی تھی۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کا خیال تھا کہ قومی دولت کا زیادہ حصہ مغربی پاکستان کی ترقی پر خرچ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس سوچ میں حق بجانب بھی تھے۔ ڈاکٹر صفدر محمود مشرقی اور مغربی پاکستان میں خرچ کیے جانے والے سرمایے کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عام تخمینے کے مطابق ۴۸-۱۹۴۷ء اور ۶۰-۱۹۵۹ء کے درمیان حکومت نے مشرقی پاکستان کی ترقی پر دو ارب پچھتر کروڑ اور مغربی پاکستان کی ترقی پر آٹھ ارب ایک کروڑ ۷۶ لاکھ روپے خرچ کیے۔ نجی شعبہ میں مجموعی ترقیاتی مصارف میں سے اسی فیصد مغربی پاکستان میں اور بیس فیصد مشرقی پاکستان میں خرچ کیے گئے۔''[۲۸]

ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ واضح نظر آ رہا ہے کہ اقتصادی میدان میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ مغربی پاکستان جیسا سلوک نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے وہ لوگ اقتصادی میدان میں پس ماندہ رہے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی بنگال کے مسلمان اقتصادی میدان میں بہت پیچھے تھے اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی قومی آمدنی کا زیادہ حصہ مغربی پاکستان سے وصول ہوتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بنگالیوں کی اس حالتِ زار میں بہتری تو پیدا ہوئی مگر ان کا معیارِ زندگی مغربی پاکستان کے لوگوں کی سطح تک نہ پہنچ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالیوں کی معاشی حالت مغربی پاکستان کے لوگوں سے مختلف تھی۔ اس قدر اقتصادی تفاوت نے مشرقی پاکستانیوں کی زندگیوں پر بہت بُرے اثرات مرتب کیے۔ صدیق سالک نے بنگالیوں کی غربت کی تصویر دکھاتے ہوئے لکھا ہے۔

> "After my wife's arrival in Dhakka, I drove the Pakistan Ceramic industries at Tongi...... On the way, a new dimension of reality dawned on me. I saw such scenes of Poverty...... The women had hardly a patch of dirty linen to preserve their modesty. The men were short and starved. Their ribs, under the thin layer of dark skin, could be counted even from a moving car...... I concluded that the poor of Bangal are poorer

than the poorest of West Pakistan.'' ۲۹ے

فاروق عادل اپنے سفرنامے ''آنکھوں نے جو دیکھا'' میں بھی بنگالیوں کی غربت کی ہیبت ناک تصویر دکھاتے ہوئے دو واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے وہاں کے لوگوں کی بھوک اور مفلوک الحالی کی صورتِ حال واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

''وہاں میں نے دیکھا کہ جس میز پر ہم تکے کھانے بیٹھے تھے وہاں میلے کچیلے کپڑوں میں تین بنگالی جھکے ہوئے جھوٹی پلیٹوں میں سے وہ ہڈیاں اٹھا کر نوچ رہے تھے جن کا گوشت ہم ابھی ابھی کھا کر اٹھے تھے...... دوسرے دن ہم موتی جھیل کے علاقے میں پھل کی دکان پر سیتا پھل کھانے کے لیے رُکے جونہی میں نے چھلکے زمین پر پھینکے۔ پتہ نہیں کس طرف سے تین لڑکے نمودار ہوئے اور زمین پر سے چھلکے اٹھا کر کھانے لگے۔ ایک لمحہ کے لیے میرا سانس رُک گیا۔'' ۳۰ے

ایوب خان کے دورِ حکومت میں اس پہلو کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ ایوب خان نے اقتصادی مساوات قائم کرنے کو حکومت کی آئینی ذمہ داری بنایا۔ چنانچہ تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کی مدت میں اس اقتصادی تفاوت کو بیس فیصد کم کرنے کی گنجائش رکھی گئی۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کے لیے سولہ ارب اور مغربی پاکستان کی ترقی کے لیے چودہ ارب روپے مختص کیے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں مشرقی پاکستان میں سرمایہ لگانے والوں کے لیے چھ سال تک ٹیکس کی چھوٹ کا اعلان کیا گیا۔ سٹیٹ بنک نے مشرقی پاکستان کے لیے قرضوں کی پالیسی میں نرمی پیدا کر دی۔ ایوب خان ان اقدامات کے ذریعے مشرقی پاکستان کے حوالے سے اقتصادی عدم مساوات کا تصور ختم کر کے برابری کی سطح پر لانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

''مشرقی پاکستان والوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ حکومت میں برابر کا ساجھا رکھتے ہیں۔ تاکہ وہ ملک کے لیے قیمتی سرمایہ ثابت ہوں۔ یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ انھیں اس ساجھے داری میں معقول حصہ دیا جائے۔'' ۳۱ے

ایوب خان کے ان اقدامات کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اقتصادی میدان میں اس قدر پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے طویل مدت کی ضرورت تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ سمگلنگ کے ذریعے مختلف چیزیں بھارت پہنچا دی جاتی تھیں اور اس دھندے میں خود بنگالی ملوث تھے۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کی تکمیل پر معلوم ہوا کہ فی کس آمدن میں فرق کہ جو پہلے ۴۵ فیصد تھا، بڑھ کر ۵۱،۸ فیصد ہو گیا۔ ایوب خان کے ان اقتصادی اقدامات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں۔

''ایوب خان نے اقتصادی تفاوت دور کرنے کے لیے پوری سنجیدگی سے کوششیں کیں اور اپنی طرف سے مشرقی پاکستان والوں کا احساسِ محرومی ختم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن نہ تو ان کوششوں کے زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوئے اور نہ مشرقی پاکستان کا احساسِ محرومی ختم ہوا۔۳۲

اس معاشی تفاوت کو دشمنوں نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا اور مختلف پمفلٹ شائع کر کے مشرقی پاکستانیوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ مغربی پاکستان والے تمھارا استحصال کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں مشرقی پاکستانی زیادہ شد و مد سے علاحدگی کی راہ پر چل نکلے۔

پاکستان کے دونوں حصوں میں اختلافات کا آغاز لسانی مسئلے سے ہوا۔ مشرقی بنگال کا خطہ اردو زبان سے کلی طور پر ناواقف نہ تھا بلکہ قیامِ پاکستان سے قبل مشرقی بنگال میں اردو کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ مسعود شہریار اس صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تقسیم سے قبل حالی کی مسدس کی آواز ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔ اقبال کے ''شکوہ'' نے لوگوں کے دلوں کو گرمایا تھا اور ظفر علی خان کی نعتوں نے عوام کے سینوں کو تقدس اور پاکیزگی عطا کی تھی۔ یہاں اردو کے رسائل و اخبارات نکلے، یادگار مشاعرے ہوئے اور تعلیمی کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔''۳۳

قیامِ پاکستان کے بعد مغربی بنگال، بہار اور مشرقی یو پی سے اُردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان ہجرت کر کے آ گئی، جس سے مشرقی پاکستان میں اردو کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ پروفیسر ہارون الرشید مشرقی پاکستان میں اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''راستوں اور بازاروں میں، ریل گاڑیوں اور بسوں میں، دفتروں اور کارخانوں میں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ہر جگہ اردو بولی جانے لگی۔ نئے نئے مکانات، نئی نئی دکانیں، نئی نئی سڑکیں، نئے نئے کارخانے بننے لگے، شہروں کی رونق میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی پھلنے پھولنے لگی۔''۳۴

قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بھائی چارے اور تعصب سے پاک فضا میں اردو کی نشو نما کا آغاز ہوا مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا اور لسانی اختلافات آہستہ آہستہ ابھر کر سامنے آنا شروع ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں سرکاری سرپرستی میں انجمنِ اردو کا قیام عمل میں آیا اور لیاقت علی خان نے اردو زبان کو پاکستان کے لوگوں کے ثقافتی ورثہ کا محافظ قرار دیا تو ڈھاکہ یونی ورسٹی کے اساتذہ نے ''تمدن مجلس'' قائم کی جس کا مقصد بنگالی زبان کا تحفظ اور فروغ تھا، ان کا

خیال تھا کہ ملک میں بنگالی بولنے والوں کا تناسب زیادہ ہے اس لیے اسے قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی، جس نے دستور ساز اسمبلی سے اردو کو قومی زبان کا درجہ دلوانے کی سفارش کی۔ جب یہ خبر ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے سیکڑوں نوجوانوں نے اس کے خلاف صوبائی سیکرٹریٹ کے سامنے مظاہرہ کیا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رولز اینڈ پروسیجر کمیٹی نے اردو اور انگریزی کو اسمبلی کی سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی تو ڈھاکہ میں ایک بار پھر اس پر شدید ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ زاہد چوہدری اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''جب کمیٹی کی اس سامراجی سفارش کی خبر ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے تعلیم یافتہ بنگالی نوجوان بہت مشتعل ہوئے اور ان کے ایک ہجوم نے پلاسی بیرکس میں انجمن اردو کے دفتر پر حملہ کر کے کئی ایک افراد کو زخمی کر دیا اور اس طرح قومی زبان کے مسئلے کی وجہ سے ڈھاکہ میں پُرتشدد ایجی ٹیشن کی ابتدا ہوگئی۔'' ۳۵

مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے زبان کے مسئلے پر بنگالیوں کے جذبات کا صحیح ادراک نہ کیا چنانچہ اس مسئلے کے سبب دونوں خطوں کے لوگوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ اسی دوران میں ایک بنگالی ہندو رکن اسمبلی دھندرا ناتھ دتہ نے اس مسئلے کو دستور ساز اسمبلی میں اٹھایا اور کہا کہ چونکہ ملک کی اکثریت بنگالی زبان بولتی ہے چنانچہ اسے بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے مگر لیاقت علی خان نے اسے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش قرار دیا اور کہا کہ قوم کے لیے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے اور وہ صرف اردو ہو سکتی ہے۔ ایک قومی زبان کے ذریعے ملک کو متحد رکھنے کی کوشش کے نتائج اس کے برعکس ہوئے اور یہ مسئلہ قوم کو تقسیم کرنے کا باعث بن گیا۔ زاہد چوہدری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اس (لیاقت علی خان) کا یہ موقف سراسر غلط تھا کہ اردو زبان مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کے رشتہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی اور وہ یہ تھی کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں مشرقی بنگال میں جو پہلا خونریز اختلافی مظاہرہ ہوا وہ اردو زبان کے مسئلہ پر ہی تھا۔ گویا اردو زبان قومی اتحاد کی علامت نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ سے قوم میں تفرقہ پڑنے کی ابتدا ہوگئی تھی۔'' ۳۶

زبان کے اس مسئلے پر پورے بنگال میں ہنگاموں اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

> ''یہ لسانی تنازعہ بالآخر تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ طالب علموں اور دیگر تعلیم یافتہ طبقوں کا تاثر یہ تھا کہ مرکزی حکومت جس پر اہلِ پنجاب کا غلبہ ہے، بنگالیوں سے ان کی مادری زبان چھین

لینا چاہتی ہے۔'' ۳۷ے

اس مسئلے کی وجہ سے بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لیے ۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا اور ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور کوئی زبان نہیں ہوگی۔ بنگال کے لوگوں نے قائداعظم کی اس بات کو پسند تو نہ کیا تاہم لوگوں کے دلوں میں قائداعظم کے لیے عقیدت کا جو جذبہ موجود تھا، اس کے طفیل وقتی طور پر زبان کی تحریک دھیمی پڑ گئی۔ Herbert Feldman کے مطابق یہ وہ دن تھا جب مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دوریوں کا بیج بو دیا گیا۔

> "It should be said that the seeds of discontent had been sown long before, perhaps on the day that Jinnah informed the people of East Pakistan that Urdu, and only Urdu, would be the national language of Pakistan." ۳۸ے

قائداعظم کی وفات کے بعد لیاقت علی خان نے بنگال کا دورہ کیا تو ڈھاکہ کے طلبا کے بڑے اجتماع میں بھی شرکت کی۔ اس اجتماع میں طلبا نے جو سپاس نامہ پیش کیا اس میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ بنگلہ کو بھی اردو کی طرح قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ جواب میں لیاقت علی خان نے ان کی سرزنش کی اور کہا کہ پاکستان کی قومی زبان کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ صرف اردو ہوگی۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مولوی عبدالحق نے مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور اس بات کا پرچار کیا کہ بنگلہ زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ مولوی عبدالحق کی اس تجویز نے بہت سے شبہات کو جنم دیا اور اسے بنگلہ زبان کو ختم کرنے کی کوشش قرار دیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب مرکزی وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن پاکستان ایجوکیشن بورڈ میں شرکت کے لیے ڈھاکہ پہنچے تو اس سے ایک دن پہلے ڈھاکہ یونی ورسٹی کے طلبا نے ایک قرارداد کے ذریعے بنگالی رسم الخط تبدیل نہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ بعد کے دنوں میں اس مطالبے کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ڈھاکہ یونی ورسٹی کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں اور عوامی سطح پر عربی رسم الخط کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اس کے باوجود بورڈ کے اجلاس میں بنگالی رسم الخط کو عربی رسم الخط میں تبدیل کرنے کے لیے ۲۰ مراکز کھولنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے جواب میں بنگال کے لوگوں نے اس فیصلے کی مذمت کی اور اسے بنگالی زبان کو کچلنے کی سازش قرار دیا۔ زاہد چوہدری رسم الخط کی تبدیلی کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''رسم الخط کے مسئلہ پر پاکستان ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کا یہ فیصلہ واقعی اشتعال انگیز تھا کیونکہ اس کی بنیاد سراسر فریب اور دھوکہ بازی پر تھی اور اس سے مشرقی بنگال کے عوام الناس میں حروف القرآن کے لیے احترام کے جو جذبات پائے جاتے تھے ان کی آڑ لے کر دیوناگری رسم

الخط کی بنگالی کو ختم کر کے وہاں اردو زبان رائج کی جا رہی تھی۔"[۳۹]

یہ مسئلہ طول کھینچتا چلا گیا اور ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء کو پورے بنگال کے طلبا نے ہڑتال کر کے یومِ بنگالی زبان منایا۔ اس دن جلوس نکالے گئے، جلسے ہوئے جن میں اردو کی طرح بنگالی کو بھی سرکاری زبان بنانے کی قراردادیں منظور کی گئیں۔ ۴ اپریل ۱۹۵۱ء کو ڈھاکہ یونی ورسٹی کی سٹیٹ لینگویج کمیٹی آف ایکشن نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کو ایک میمورنڈم دیا جس میں بنگالی زبان کے مقابلے پر اردو کو مفلس اور تہی دامن قرار دیا گیا۔ ۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو ڈھاکہ یونی ورسٹی کے طلبا نے "فلیگ ڈے" منایا تاکہ بنگالی زبان کو قومی زبان کا درجہ دلوانے کے لیے رائے عامہ کو ہموار کیا جائے اور اس مقصد کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ ادھر کراچی میں ۱۴ اور ۱۵ اپریل ۱۹۵۱ء کو دو روزہ اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں گورنر جنرل ناظم الدین نے اردو کو پورے پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دیا جس کے نتیجے میں جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لسانی مسئلہ حل ہونے کی بجائے بگڑتا چلا گیا۔ محمود الرحمٰن اس مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "ان ہی دنوں بنگال میں لسانی تحریک زور پکڑنے لگی۔ حکومت نے اس کا تصفیہ کرانے کی بجائے تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ حکومت کی بے تدبیری اور نا اہلی کے سبب اس نے ایک عوامی تحریک کا روپ لیا اور "بنگلہ بھاشا" مشرقی پاکستان کا قومی مسئلہ بن گئی۔"[۴۰]

انھیں احتجاجی مظاہروں کے دوران ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو پولیس کے ہاتھوں دو طالب علم مارے گئے چنانچہ امن وامان کی بحالی کے لیے فوج طلب کرنا پڑی۔ ڈھاکہ میں مارے گئے ان طالب علموں کی یاد میں شہید مینار بنایا گیا۔ مشرقی پاکستان میں بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرانے کے حق میں مظاہروں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار بنگالیوں کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء میں مرکزی حکومت کی دستور ساز اسمبلی نے بنگالی کو بھی قومی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا مگر اس وقت تک یہ لسانی مسئلہ دونوں حصوں کے درمیان اس قدر تفرقہ پیدا کر چکا تھا کہ جس کا انجام ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے سانحے کی صورت میں سامنے آیا۔ اگر یہی فیصلہ حالات بگڑنے سے پہلے کر دیا جاتا تو مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی نفرت سے بچا جا سکتا تھا۔ سعید الدین کے بقول "زبان کے مسئلے کو ابتدا ہی میں حل کر دیا جاتا تو زبان کے مسئلے پر بنگالیوں میں جو نفرت مغربی پاکستان کے خلاف پیدا ہوئی، وہ نہ ہوتی۔"[۴۱] سانحہ مشرقی پاکستان کے وقوع پذیر ہونے میں لسانی تنازعہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "زبان کے مسئلے پر مشرقی بنگال اور مغربی حکومت کے درمیان ایک ایسے تنازعے کی صورت پیدا ہو گئی جو بالآخر پاکستان ٹوٹنے کی بنیاد بن گیا۔"[۴۲]

دراصل قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے حکمرانوں اور دانش وروں نے مشرقی پاکستان کے جغرافیائی تحفظ، سیاسی، اقتصادی، لسانی اور تہذیبی عوامل اور ان کی بہتری کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ ان تمام پہلوؤں سے مغربی پاکستان کو برتری

دی گئی اور یہ خیال کیا گیا کہ محض مذہب کا رشتہ دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے کے لیے کافی ہے، مگر یہ تصور حقیقت کے برعکس تھا جس کا نتیجہ دونوں حصوں کی علاحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ منیر احمد شیخ اس المیے کے مذکورہ پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مشرقی پاکستان کے المیے کی بنیادی حقیقت یہی ہے کہ قوموں کی زندگی میں فیصلے جن عناصر پر منحصر ہوتے ہیں ان میں اولیت ان کے اقتصادی مفاد، تہذیبی تحفظ، جغرافیائی سالمیت اور بین الاقوامی تعلقات کی نزاکت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس میں مذہبی رشتے کا کردار کس قدر رہ گیا ہے وہ کسی حقیقت پسند سے مخفی نہیں رہ گیا۔ مذہب ہی اگر سب سے طاقت ور عنصر باہمی اتحاد و یگانگت کا ہوتا تو مشرقی پاکستانی اپنی تہذیبی زندگی کے دوسرے عناصر کو اس قدر اہمیت نہ دیتے جو انھوں نے دی اور اپنے سیاسی و تہذیبی وجود کو پاکستان کی اکائی میں غیر محفوظ سمجھا اور بالآخر ہم سے الگ ہو گئے۔'' ۴۳

ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں لسانی مسئلے کی اس تحریک اور بعد ازاں علاحدگی کی تحریک میں طلبا نے دیگر طبقوں کی نسبت زیادہ حصہ لیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف سوچتے وقت اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور اپنے مقاصد کے لیے تعلیمی اداروں کو استعمال کیا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مشرقی پاکستان میں مسلمان تعلیمی میدان میں بھی پسماندہ تھے اور دیگر میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی ہندو غالب تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں موجود ہندو اور علاحدگی پسند بنگالی اساتذہ ایک طرف نوجوانوں میں بنگالی قومیت کا جذبہ ابھارتے رہے اور بنگالیوں اور ہندوؤں کو تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے ایک رشتے میں جوڑنے کی کوشش کرتے رہے تو دوسری طرف ان طالب علموں کے ذہنوں میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر گھولتے رہے۔ ہندو اور علاحدگی پسند عناصر خاموشی سے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف رہے جب کہ حکومتی حلقوں نے اس مسئلے کو توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ اے۔ ایم۔ کے۔ ماسوانی اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"In the meantime, silent work was in progress in the Dacca University and some of the colleges, most particularly the Jagannath College at Dacca. This work was carried on by Hindu lecturers and professors." ۴۴

ایک موقع پر حکومتِ پاکستان نے ''دیش کرشتی'' نامی کتاب ثانوی درجے کے نصاب میں شامل کی جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نظریاتی رشتوں کو ابھارا گیا تو اس کتاب کے خلاف یہ کہہ کر مہم کا آغاز کیا گیا کہ اس کے الفاظ

مشکل ہیں۔اس کے خلاف قمرالدین کی کتاب ''سوشل ہسٹری'' پرحکومت نے پابندی عاید کردی کیونکہ اس کتاب میں بنگال کا ثقافتی رشتہ کلکتہ کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی تھی۔طلبا نے اس کتاب کے حق میں پُر جوش تحریک چلائی۔مشرقی پاکستان کے ان علاحدگی پسند اساتذہ نے طلبا کو اس بات کا یقین دلایا کہ مشرقی پاکستان کی تمام تر دولت پر مغربی پاکستانی قابض ہیں۔طلبا پر ان نظریات کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب علاحدگی کی تحریک زوروں پر تھی تو یونی ورسٹی میں جا بجا اس نوع کے پوسٹر نظر آتے تھے مثلاً ایک گائے کا تصویری پوسٹر لگایا گیا جو مشرقی پاکستان کی گھاس کھا رہی ہے مگر دودھ مغربی پاکستان والوں کو دے رہی ہے،اسی طرح ایک اور پوسٹر دکھایا گیا جس میں مشرقی پاکستان کا نقشہ دکھایا گیا جس کے اردگرد سانپ کنڈلی مارے پھنکار رہا تھا۔طلبا کے ذہنوں میں یہ سارا زہر علاحدگی پسند اساتذہ نے بھرا۔انور رضا ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''قیامِ پاکستان کے بعد ہندو اساتذہ نے بنگالی نوجوان کو مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔یہ اساتذہ طلبا کے لیے جو کتب تجویز کرتے ان میں سے بیشتر نظریۂ پاکستان کے خلاف مواد پر مشتمل ہوتیں۔متعدد تعلیمی ادارں میں بابائے قوم کے بجائے گاندھی اور جواہر لال نہرو کی تصاویر آویزاں کرنے کو ترجیح دی گئی۔''۴۵

مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں پر علاحدگی پسند عناصر کے اس قدر غلبے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ ادارے مالی معاملات میں ہندوؤں کے دست نگر تھے۔امِ سلمیٰ کے بقول:

''قیامِ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں موجود ۱۲۹۰ سکولوں اور ۴۷ کالجوں میں سے ۹۰ فیصد ہندو سرمایے سے چل رہے تھے۔ان تمام اداروں میں اساتذہ اور طلبا کی غالب اکثریت ہندو تھی۔''۴۶

یہ ہندو اساتذہ مشرقی پاکستان کے طلبا کے دلوں میں مغربی پاکستان کے لیے نفرت کا زہر بھرتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی میں طلبا ہراول دستے میں نظر آئے۔سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے اسباب میں ان ہندو اور علاحدگی پسند بنگالی اساتذہ کے کردار کا جائزہ لیتے وقت جب ہم مشرقی پاکستان میں موجود غیر بنگالی اور مغربی پاکستانی اساتذہ کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو اپنی کوتاہی اور غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔بشیر منصوران غیر بنگالی اور مغربی پاکستانی اساتذہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ اساتذہ علی گڑھ،لکھنؤ اور لاہور کی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے گئے تھے چنانچہ بنگالی طلبا کے لیے ان اساتذہ کے طور طریقوں میں اجنبیت جھلکتی تھی۔اس کے برعکس کلکتہ کے پڑھے ہوئے اساتذہ کا بنگالی پن، بنگالی طلبا کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوگیا۔چنانچہ بنگالی

طلبا نے غیر بنگالی اساتذہ کا اثر قبول کرنے کی بجائے ہندو اور بنگالی اساتذہ کا زیادہ اثر قبول کیا۔''۴۷؎

قیامِ پاکستان کے بعد نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم تبدیل کرنے کی سخت ضرورت تھی مگر اس طرف توجہ نہ دی گئی اور تعلیمی اداروں میں دوقومی نظریے اور پاکستانیت کے پرچار کی بجائے پاکستان دشمن نظریات پرورش پاتے رہے۔

''چوبیس برس میں مشرقی پاکستانی طلبا کو جس قسم کی تعلیم دی جاتی رہی اور جس طرح بھارتی پروپیگنڈے سے انھیں بدظن کیا گیا۔ اس کے زیرِ اثر وہاں کا نوجوان طبقہ بالخصوص طلبا اپنے آپ کو پاکستانی سمجھنے کی بجائے بنگالی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔''۴۸؎

تعلیمی میدان میں چوبیس برسوں میں کی گئی دشمنوں کی اس محنت اور ہماری غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی تحریک میں وہاں کے طلبا نے ہراول دستے کا کام سرانجام دیا۔

درس گاہوں کے علاوہ علمی و ادبی میدان میں بھی دوقومی نظریے کا پرچار اس طرح نہ کیا گیا کہ لوگوں کے دلوں میں پاکستان سے محبت کا جذبہ فروغ پاتا۔ مشرقی پاکستان کے ادب پر رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے ہندوؤں کی تحریروں کا اثر تھا۔ ان تمام چیزوں نے مل کر بنگالی قومیت کا جذبہ ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہی بنگالی جنھوں نے ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر پاکستان حاصل کیا، اپنے آپ کو پاکستانی کی بجائے بنگالی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ خالد جاوید احمد کے بقول ''قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں اپنی تہذیب و ثقافت پھیلانا شروع کر دی تھی۔ جس کے باعث نئی نسل کے ذہن نظریۂ پاکستان سے دور ہوتے گئے۔''۴۹؎ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں بنگالی قومیت کا احساس اجاگر کرنے کی اس مہم کا آغاز تو بہت پہلے کر دیا گیا تھا اسی طرح دونوں حصوں کے درمیان موجود مختلف تضادات ابھارنے کا آغاز بھی تقسیم ہندوستان کے فوراً بعد کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن ابوالمنصور نے اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے دونوں حصوں میں مشترکہ اقدار کی عدم موجودگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''پاکستان ایک منفرد ملک ہے اس کے دو بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زائد کا فاصلہ ہے۔ مذہب اور مشترکہ جدوجہدِ آزادی کے سوا ان کے درمیان کوئی قدر مثلاً زبان، ثقافت غرض کچھ بھی مشترک نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دونوں صوبوں میں مشترکہ اقدار عنقا ہیں جن کی موجودگی کسی قوم کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔''۵۰؎

زاہد چوہدری کا کہنا ہے کہ ''مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال کے درمیان نہ صرف فاصلہ بہت زیادہ تھا بلکہ ملک کے ان دونوں علاقوں میں جغرافیائی، تاریخی، نسلی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے بھی زمین و آسمان کا فرق

تھا۔''۵۱ لوگوں کے دلوں سے اس فرق کو ختم کرنے کے لیے جہاں دور رس اقدامات کی ضرورت تھی وہاں یہ اقدامات اٹھانے کے لیے ایسی غیر معمولی بصیرت اور دانشمندی بھی درکار تھی کہ جس کے ذریعے اہلِ بنگال کی ثقافت کو مناسب مقام دے کر انھیں واحد اسلامی ثقافتی رشتے میں پرو دیا جاتا مگر افسوس اس ضمن میں کی گئی اکثر کوششوں کا نتیجہ منفی صورت میں سامنے آیا۔

"Every attempt made by the Pakistan Government to foster a cultural uniformity based on Islamic culture in East Pakistan produced a sharp reaction; the Bangalis began to look more and more to West Bangal for cultural affinity and bonds. Culturally and perhaps psychologically, the country was divided long before the crisis of 1971." ۵۲

یہ اختلافات کم ہونے کے بجائے آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور ملک کی تقسیم پر منتج ہوئے۔مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھانے میں، مشرقی پاکستان میں تعینات، مغربی پاکستانی افسروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کا انتخاب کرنے والے انڈین سول سروس کے ۸۳ افسروں میں سے صرف ایک بنگالی تھا۔ ۱۹۶۴ء تک بھی ملک کی سول سروس میں بنگالیوں کی پوزیشن یہ تھی کہ اعلیٰ عہدوں پر دو بنگالی فائز تھے جو قائم مقام سیکرٹریوں کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ان حالات میں مجبوراً مغربی پاکستانی افسروں کی بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں تعینات کی گئی۔ مشرقی پاکستان کے لوگ شروع ہی سے مغربی پاکستانی افسروں کی اس تعیناتی سے ناخوش تھے اور اس کا بڑا سبب مغربی پاکستانی افسروں کا رویہ تھا۔ یہ افسران اپنے آپ کو بنگالیوں سے بالاتر تصور کرتے تھے۔ ان کے اس رویہ سے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ وہاں خادم نہیں حاکم بن کر بھیجے گئے ہوں۔ عام بنگالی کی ان تک رسائی انتہائی دشوار تھی ان کے دفاتر اور طرزِ رہائش سے رعونت کا احساس ٹپکتا تھا۔ عنایت اللہ مغربی پاکستان کے ان افسروں کے رویوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مغربی پاکستان سے جو سرکاری افسر وہاں جاتا تھا اس کا طرزِ گفتگو اور طرزِ عمل حاکموں والا ہوتا تھا۔ افسر شاہی کے یہ نمایندے مشرقی پاکستان میں جا کر اپنے کردار اور اپنی گفتار سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ خادم نہیں بلکہ ان کے حکمران ہیں۔ مغربی پاکستان سے جانے والے افسروں کو مشرقی پاکستان کے عوام مل ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ افسر عوام کی اپنے ساتھ ملاقات کو خود دشوار بلکہ ناممکن

بناتے تھے تاکہ حاکم اور محکوم کے درمیان خلیج قائم رہے۔'' ۵۳

ڈاکٹر صفدر محمود اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''مشرقی پاکستان میں متعین کیے جانے والے مغربی پاکستانی افسر بھی دونوں صوبوں کے درمیان دوری میں اضافے کا باعث بنے۔ مقامی آبادی سے ان کا رویہ مغائرت پر مبنی تھا اور اس امر کی غمازی کرتا تھا جیسے بنگالی ان کے ہم وطن ہونے کی بجائے کسی دوسری قوم کے باشندے ہوں۔'' ۵۴

علاحدگی پسند عناصر کے لیے مغربی پاکستانی افسروں کی پیدا کردہ خلیج نہایت سُود مند ثابت ہوئی۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یقین دلایا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ آزاد نہیں ہوئے بلکہ ان کے آقا بدل گئے ہیں۔ نفرت کی یہ خلیج آہستہ آہستہ بڑھتی گئی جس کا انجام سانحۂ مشرقی پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔

مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علاحدہ کرنے میں بھارت سمیت دنیا کے مختلف ممالک نے جو کردار ادا کیا، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بین الاقوامی طور پر ایسے حالات نے جنم لیا کہ پوری دنیا میں پاکستان کی حمایت میں آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کا یہ کہنا حقیقت کا درجہ رکھتا ہے کہ ''اپنی پوری تاریخ کے دوران اہلِ پاکستان نے خود کو کبھی اس طرح یکہ و تنہا اور غیر محفوظ محسوس نہیں کیا تھا جس طرح ۱۹۷۱ء میں کیا۔'' ۵۵

امریکہ سمیت دنیا کے مختلف ممالک کے ساتھ بہتر تعلقات کے باوجود کوئی ملک مشکل کی اس گھڑی میں پاکستان کی مدد کو نہ آیا۔ محمد فیاض کے بقول:

''پاکستان کو دولخت کرنے میں بین الاقوامی کردار کے حوالے سے جہاں ہم روس، امریکہ اور بھارت کی بات کرتے ہیں۔ وہاں ہمیں یہ حقیقت بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلامی دنیا میں بھی عراق، شام، مصر، لیبیا وغیرہ روس کی لابی میں شامل ہونے کی وجہ سے پاکستان کی نسبت بھارت کے حلیف تھے۔'' ۵۶

ذوالفقار علی بھٹو دنیا کے مختلف ممالک کے رویے کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"The attitude of foreign powers in our crisis has been disappointing, if not unfriendly...... In spite of our good record in international relations, the attitude of most countries except for China has been vacillating and ambivalent in our hour of crisis." ۵۷

پاکستان کے ساتھ دشمنی نبھانے میں بھارت تو پیش پیش تھا مگر بھارت کے دوست ملک روس نے بھی مشرقی پاکستان کی علاحدگی میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان نے روزِ اول سے روس کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار نہ کیے اور پاکستانی حکمرانوں کا جھکاؤ امریکہ کی طرف رہا۔ خصوصاً روس کی طرف سے دعوت کے باوجود جب لیاقت علی خان نے روس کا دورہ نہ کیا تو دونوں ممالک کے درمیان مغائرت کا آغاز ہو گیا، جب کہ دوسری طرف بھارت اور روس کے تعلقات کی گرم جوشی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دریں اثنا پاکستان نے چین اور امریکہ کے باہمی تعلقات بہتر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا، جسے روس نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے بحران کے دنوں میں روس نے بھارت کو بڑی تعداد میں اسلحہ اور ماہرین کی مدد فراہم کی۔ اس کے علاوہ بھارت نے دنیا بھر میں پروپیگنڈا کر کے دنیا کے باقی ممالک کی ہمدردیاں بھی اپنے حق میں سمیٹ لیں، جب کہ پاکستان اس محاذ پر ناکام رہا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں اس پہلو کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

> ''بھارتی پروپیگنڈا اس قدر کامیاب تھا کہ فوجی حکومت کی جانب سے مشرقی پاکستان کی صورتحال کو معمول کے مطابق ظاہر کرنے کی تمام تر کوششیں رائیگاں ہو گئیں اور بین الاقوامی رائے عامہ پر ان کا قطعاً کوئی اثر نہ ہو سکا جس کے نتیجے میں دنیا کے کسی بھی ملک نے بھارت کو مشرقی پاکستان کے معاملات میں براہِ راست مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اسے متعدد بڑی طاقتوں کی پوری حمایت اور ہمدردی حاصل رہی جن میں بلاشبہ روس بھی شامل تھا۔'' ۵۸

بھارت کو دوست ملک روس کی پوری معاونت حاصل تھی جب کہ دوسری طرف پاکستان کے دوست ملک امریکہ کا موقف کوئی واضح صورت اختیار نہ کر سکا۔ امریکہ کے جنوبی ایشیا میں اپنے مخصوص مفادات تھے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھارت اور روس کی ملی بھگت سے پاکستان کا خاتمہ ہو جائے اور پورے برصغیر پر بھارتی غلبے کی صورت میں روسی اثرات غالب آ جائیں۔ اس کے باوجود امریکہ پاکستان کی حمایت میں خود کو کسی بڑی جنگ میں ملوث کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑا ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس وقت خلیج بنگال میں داخل ہوا جب مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج ہتھیار ڈالنے کے قریب پہنچ چکی تھیں، جس کا مقصد بھارت کو یہ باور کرانا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مشرقی پاکستان تک محدود رکھے۔

> ''اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ بنگالیوں کی علاحدگی کی تحریک کو امریکہ کی پوری ہمدردی حاصل تھی اور وہ پاکستانی فوج کو شکست سے بچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ دراصل اس کی حکمت عملی کا مقصد اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے،

اور علاقے میں بھارت یا روس کی بالا دستی کے خطرے کے پیش نظر مغربی پاکستان کو ٹوٹنے سے بچانا تھا۔''۵۹

پاکستان اور چین کے درمیان ۱۹۵۰ء میں سفارتی تعلقات قائم ہونے کے بعد چین نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا۔ ۱۹۷۱ء کے بحران میں بھی چین نے ہر ممکن اخلاقی اور مادی امداد مہیا کی تاہم پاکستانی حکمرانوں کا یہ خیال کہ پاکستان پر بھارتی حملے کی صورت میں چین بھارت پر حملہ کر دے گا، درست ثابت نہ ہوا اور ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول:

''پاکستان کے عوام کے لیے یہ امر غیر معمولی مایوسی کا باعث بنا کہ چین نے نومبر ۱۹۷۱ء میں بھارت پر اس وقت کوئی فوجی دباؤ نہ ڈالا جب وہ روس کے تعاون سے مشرقی پاکستان پر چڑھ دوڑا تھا۔''۶۰

دراصل اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بھارت اور چین کے درمیان کچھ ایسی مثبت تبدیلیاں سامنے آ چکی تھیں کہ چین کا بھارت پر حملہ مشکوک ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ چین بھارت پر حملہ کر کے روس سے براہِ راست تصادم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن کے سبب چین نے اس جنگ میں عملی مداخلت کر کے پاکستان کی مدد تو نہ کی تاہم اس نے فوجی ساز و سامان اور سفارتی میدان میں پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔ اس پس منظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں بھارت، روس اور امریکا نے مشرقی پاکستان کی علاحدگی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ سید شبیر حسین، مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے عمل میں شامل مختلف ممالک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''The three powers were again involved when Pakistan was shaken by its internal chaos, ... It (Russia) made its physical presence in the war as an Indian ally, and America was again ineffective, and China helpless, though largely because Pakistani leaders were indulging in "hara kiri"'' ۶۱

عسکری حوالے سے بھارت پہلے ہی غالب قوت کی حیثیت رکھتا تھا، جب کہ پاکستان کا مشرقی حصہ اتنی بڑی جنگ کے لیے تیار نہ تھا، اس پر جب بھارت کو دنیا کے دیگر ممالک کی مدد اور حمایت بھی حاصل ہو گئی تو اس نے آسانی سے اپنا مقصد پورا کر لیا۔

مشرقی پاکستان میں پاکستان کی شکست کی فوری وجہ پاکستان کا مشرقی حصے کے محاذ پر عسکری طور پر کمزور ہونا بھی

تھا۔ ہماری نصف سے زیادہ آبادی مشرقی حصے میں آباد تھی اور وہ حصہ تین اطراف سے دشمن ملک بھارت میں گھرا ہوا تھا، جنوب مشرق میں ایک چھوٹا سا حصہ برما سے ملتا تھا جب کہ چوتھی طرف خلیج بنگال واقع تھا۔ مشرقی حصے کی اس نازک صورتِ حال کے باوجود اسے دفاعی نکتہ نظر سے اہمیت نہ دی گئی اور ہمیشہ یہ کہا گیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہ مفروضہ غلط ثابت ہو گیا اور بنگالی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر مغربی پاکستان ان کا تحفظ نہیں کر سکتا تو پھر انھیں اس کے ساتھ جڑا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔

"The Bangalis began to agree, why do we not settle our own diplomatic and external relations? Why depend on West Paksitan, which could give no protection to East Paksitan? Within one hour of the war beginning, East Pakistan was cut off, not only from West Pakistan but from the rest of the world. So that old argument that the defence of East Pakistan lay in West Pakistan no longer held water." ۶۲

۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان سترہ دنوں تک مغربی پاکستان سے کٹ کر رہ گیا تھا اور جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے بقول مشرقی پاکستانیوں کے اندر "یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اگر فوج کا بڑا حصہ مغربی پاکستان میں رہتا ہے تو پھر انھیں پاکستان سے اتحاد کا تو کوئی عملی فائدہ نہ ہوا۔"[۶۳] ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد اس لائحہ عمل پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر بدقسمتی سے اس پہلو کو نظر انداز کیا جاتا رہا اور ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔ اس مفروضے کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان میں فوجی قوت بڑھانے پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ عنایت اللہ اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ڈھاکہ میں صرف ایک ہوائی اڈا بنایا گیا تھا۔ فضائیہ کا وہاں صرف ایک سکواڈرن رکھا گیا۔ فوج بھی کم رکھی گئی اور بحریہ بھی برائے نام، حالانکہ وہ ہمارے ملک کا ایسا حصہ تھا جہاں ضرورت کے وقت افواج پہنچانا ناممکن ہو سکتا تھا اور ہوا بھی۔ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کی نسبت زیادہ مستحکم ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ تین اطراف سے دشمن کے نرغے میں تھا...... مشرقی پاکستان میں لمبے عرصے کے محاصرے میں لڑنے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔" ۶۴

حقیقت یہ ہے کہ دفاع کے حوالے سے مشرقی پاکستان کو شروع سے ہی نظر انداز کیا گیا۔ چنانچہ دیگر معاملات کی طرح دفاع میں بھی وہ حصہ پیچھے رہ گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دفاع کے معاملے میں بھی ساری توجہ مغربی پاکستان پر مرکوز تھی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج نہ صرف ہتھیاروں اور عددی قوت کی کمی کا شکار تھی بلکہ اسے شدید عوامی مخالفت کا بھی سامنا تھا اور یہ وہ عناصر تھے جن کے ہوتے ہوئے جنگ جیتنا مشکل تھا۔ میجر جنرل فضلِ مقیم خان اس صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "Pakistan had only three infantry divisions without their own components of heavy weapons, and could not look forward to any substantial relief or reinforcements; some foreign experts at the time had estimated that Pakistan would need 250,000 to 300,000 troops trained in counter-insrugency operations and fully packed up by socio-political campaigns to control the situation in East Pakistan." ۶۵

مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی فوجی صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "میرے پاس صرف تین نامکمل اور نیم آراستہ ڈویژنیں تھیں۔ چونکہ دو ڈویژنیں ہوائی جہاز سے آئی تھیں لہٰذا وہ اپنے ٹینک، توپ خانے، انجینئرنگ کے ذخائر مثلاً سرنگیں اور خاردار تاریں نہیں لا سکی تھی......کوئی فوج بھی آج کل فضائیہ کی مدد کے بغیر جنگ نہیں لڑ سکتی، میرے پاس جہازوں کا صرف ایک سکواڈرن تھا اور صرف ایک ہوائی اڈا، ریڈار تو صحیح معنوں میں کوئی تھا ہی نہیں۔ پانچ سو میل کے سمندری ساحل اور جہاز رانی کے قابل تین طاقت ور دریاؤں کے لیے میرے پاس صرف چار چھوٹے جنگی جہاز تھے۔" ۶۶

دفاعی لحاظ سے کمزور مشرقی پاکستان میں موجود افواج کو مزید کمزور بنانے میں مکتی باہنی نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کے پاس بھارت کا دیا گیا اسلحہ بھاری تعداد میں موجود تھا، وہ علاقوں سے پوری طرح واقف تھے، موسمی حالات سے مانوس تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں مقامی آبادی کی بڑی تعداد کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ مکتی باہنی نے بہت عرصے سے ملک کے اندر فوج سے ٹکر لے رکھی تھی اور پاکستانی فوج ان کے خلاف اسلحہ اور طاقت خرچ کر رہی تھی۔ اب تک کے حالات کے پیشِ نظر بھارت اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی صرف مکتی باہنی

کے بس کا کام نہیں چنانچہ اس نے مشرقی محاذ پر ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی مشرقی پاکستان کے گورنر ڈاکٹر عبدالمالک اسلام آباد پہنچے اور صدر کے ساتھ ملاقات میں سیاسی سمجھوتے اور جنگ بندی کا مشورہ دیا مگر اسلام آباد میں حکمرانوں نے ان کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور وہ واپس مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ان حالات میں جب کہ مشرقی پاکستان میں دفاعی صورتِ حال تسلی بخش نہ تھی، دشمن کو روکنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے اور مغربی محاذ پر دشمن پر اس قدر بھاری حملہ کیا جائے کہ مجبوراً مشرقی محاذ پر اسے اپنی افواج میں کمی کرنا پڑے۔ جنرل گل حسن خان اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہمیں یقین تھا کہ جونہی صورتحال بھارت کے لیے موزوں ہوئی وہ مشرقی پاکستان پر حملہ کرے گا اور ہم یقینی طور پر اپنی تحویل میں موجود فورسز کے ساتھ بھارت کے عزائم کی مزاحمت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک واحد راستہ جو ہمارے پاس رہ گیا وہ یہ تھا کہ ایک بھرپور جوابی حملہ مغرب کی طرف سے بھارت کے اندر لانچ کیا جاتا۔'' ۶۷

چنانچہ مغربی محاذ پر ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارت پر حملہ کر دیا گیا مگر افسوس کہ اس محاذ سے بھی دشمن کو کوئی بڑا نقصان نہ پہنچایا جا سکا۔ جس انداز میں یہ حملہ کیا گیا اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے حکمران اس محاذ سے بھرپور حملہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔

''اب یہ حقیقت سب کو معلوم ہو چکی ہے کہ پاکستان نے مغربی محاذ پر بھی اپنی تمام فوجیں متعین نہیں کی تھیں۔ چنانچہ متعدد نوجوان افسروں نے اس طرزِ عمل کی مذمت کرتے ہوئے جی۔ایچ۔کیو کو احتجاجی خطوط لکھے۔ پاکستانی افواج نے دشمن کے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا مگر یہ کامیابیاں ان محاذوں پر حاصل ہوئیں جہاں بھارتی فوجوں نے ہلکی پھلکی مزاحمت کے بعد اپنی محفوظ چوکیوں پر جانا مناسب سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیز رفتار بکتر بند دستوں پر مشتمل مغربی پاکستان میں متعین پاکستانی فوج کی اہم یونٹوں نے اس جنگ میں ایک فائر بھی نہ کیا۔'' ۶۸

جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا کہنا ہے کہ مغربی پاکستان کے محاذ سے یہ حملہ ان کے علم میں لائے بغیر کیا گیا۔ وہ بد دلی سے کیے گئے اس حملے کو سازش سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''یہ حملہ میرے علم کے بغیر کیا گیا۔ اس کا آغاز بھی تاخیر سے ہوا۔ اس کمزور اور تاخیر سے کیے گئے حملے نے مشرقی پاکستان کے تحفظ کو عملاً ناممکن بنا دیا۔ اگر مغربی پاکستان سے اس نیم دلانہ حملے کا آغاز نہ ہوتا تو ہماری تاریخ مختلف ہوتی۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ حملہ ایک سازش کے تحت کیا

گیا۔''۶۹ے

مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کے کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، مشرقی حصے میں فوج کی ناکامی کا سبب مغربی حصے میں بے دلی سے کیے جانے والا یہ حملہ قرار دیتے ہیں۔

''صورتِ حال کے بھرپور تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ پہلے سے موجود اس نظریے کے مطابق کہ ''مشرق کی جنگ، مغرب میں لڑی جائے گی'' ترپ کے اس پتے، یعنی مغربی پاکستان میں تعینات مضبوط فوج کے بروقت استعمال میں ناکامی کی وجہ سے ہم جنگ ہار گئے۔''۷۰ے

قیامِ پاکستان کے وقت سے قائم کیا جانے والا یہ مفروضہ بھی اس جنگ میں غلط ثابت ہو گیا اور مشرقی پاکستان کی صورتِ حال آئے دن بگڑتی چلی گئی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنرل نیازی نے چیف آف جنرل سٹاف پر ایک پیغام کے ذریعے ساری صورتحال واضح کی اور ڈھاکہ کو بچانے کے لیے مزید کمک کی درخواست کی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو گورنر عبدالمالک نے صدر کے نام فوری جنگ بندی اور سیاسی سمجھوتے کی درخواست کی، جس کے جواب میں صدر نے انھیں مناسب فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔ اس دوران میں بھارتی فوجیں ڈھاکہ کے مضافات تک پہنچ چکی تھیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی فوجوں نے گورنر ہاؤس پر راکٹوں سے حملہ کیا تو گورنر اور ان کی کابینہ نے استعفیٰ دے کر ریڈ کراس سے پناہ طلب کر لی۔ مشرقی پاکستان میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک تمام تر بے سروسامانی کے باوجود جنگ جاری رہی اور مشرقی پاکستان میں متعین قلیل اور تھکی ہوئی افواج نے ممکنہ حد تک دشمن کا بہادری سے مقابلہ کیا مگر نامساعد حالات میں جنگ جیتنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے دن مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کے کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے بھارتی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے اس سانحہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''جہاں تک سقوطِ ڈھاکہ کا تعلق ہے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ڈھاکہ کے دفاع کا منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا اور فوجی نقطۂ نظر سے مزید کچھ روز تک جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں حالات ابھی اس نوبت تک نہیں پہنچے تھے کہ فوری طور پر ہتھیار ڈالنا ضروری ہوتا۔ اس مرحلے پر اگرچہ جنرل نیازی کے خلاف کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے نہ صرف ملک کو ایسی احمقانہ جنگ میں جھونک دیا تھا جس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی بلکہ انھوں نے جنرل نیازی کو نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب بھی دی کہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر پوری قوم کو ذلیل کریں جس کی اسلام کی پوری تاریخ میں کوئی

مثال نہیں ملتی۔''اے

مسعود مفتی جو مشرقی پاکستان کے آخری دنوں میں وہاں بطور سیکرٹری تعلیم تعینات تھے، نے اس سانحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے اسباب وعلل کو نہایت گہرائی میں سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کے مختلف زاویوں کو بے نقاب کیا۔ وہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کو پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹروں اور وڈیروں کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ اس سانحے کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''مشرقی پاکستان کے متعلق میری تمام تحریروں میں بکھرے ہوئے نقطۂ نظر کو صرف چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آمرانہ پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹروں اور وڈیروں کا گٹھ جوڑ مشرقی پاکستان کی جمہوریت اور بلند بانگ اکثریت کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس لیے انھوں نے بہت پہلے سے مشرقی پاکستان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر مناسب حالات پیدا کرنے کے لیے محب وطن بنگالیوں کو نظر انداز کر کے علیحدگی پسند بنگالیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور بالآخر ہندوستان سے مصنوعی جنگ کر کے بڑی عجلت میں دانستہ ہتھیار ڈال دیے گئے تا کہ باقی ماندہ پاکستان ان کی گرفت میں رہے۔''۲ے

سیاسی، معاشی، لسانی وجوہات کے ساتھ ساتھ ہمارے ارباب بست وکشاد کی نااہلیوں اور اقتدار کی ہوس کے باعث آخرِ کار برعظیم کے مسلمانوں کو تاریخ کے اس دن کی سیاہی دیکھنا پڑی۔

''یہ دن ہمارے ملک کے ایک عظیم حصے پر دشمن کے قبضے کا دن ہے۔ یہ بڑا بھیانک اور بڑا المناک دن ہے۔ اس دن کے بعد ہماری تاریخ داغ دار ہو گئی ہے۔ اب مسلمان مائیں اپنے بچوں کو اپنی تاریخ کی درخشاں داستانیں سنائیں گی تو یہ دن ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا۔''۳ے

سقوطِ ڈھاکہ کا یہ سانحہ کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے ہماری نااہلیوں، حماقتوں، اقتدار کی ہوس اور دشمن کی سازشوں کی طویل داستان ہے۔ یہ ایسا المیہ تھا جس نے پاکستانی قوم کو شدید احساسِ ذلت اور احساسِ شکست میں مبتلا کر دیا۔ ایک قوم کے دو گروہوں کے درمیان لسانی بنیادوں پر ابھرنے والے چند تضادات نے ایسی بھیانک صورت اختیار کر لی کہ قوم کا ہر محب وطن فرد ذاتی اور قومی سوگ میں ڈوب گیا۔

حوالہ جات

۰۱۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سقوطِ مشرقی پاکستان، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲

۰۲۔ سلیم منصور خالد، البدر، لاہور، ادارہ مطبوعاتِ طلبہ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱

۰۳۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سقوطِ مشرقی پاکستان، محولہ بالا ا، ص ۴۳

۰۴۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز، لاہور، نگارشات، بار دوم ۲۰۰۵ء، ص ۲۵

۰۵۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۰۶۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، راول پنڈی، مکتبہ سرمد، بار نہم ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۴

۰۷۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷

۰۸۔ ڈاکٹر صفدر محمود، مسلم لیگ کا دورِ حکومت ۱۹۴۷ء-۱۹۸۴ء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۷

۰۹۔ Williams, L. F. Rushbrook, Pakistan Under Challenge, London, Stacey International, 1975, P.38

۱۰۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا محولہ بالا ۷، ص ۲۶

۱۱۔ تفضل حسین مانک میاں، متحدہ پاکستان کے ۲۰ سال، لاہور، گوتم پبلشرز، س۔ن، ص ۲۰۶

۱۲۔ حافظ تقی الدین، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۵ء، ص ۴۱۹

۱۳۔ جی۔ ڈبلیو۔ چوہدری، ''مشرقی پاکستان کے آخری ایام''، مترجم: ممتاز اقبال ملک، لاہور ہفت روزہ ''اداکار'' ۱۰ تا ۱۶ اگست ۱۹۷۵ء، ص ۴۹

۱۴۔ وکیل انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، لاہور، دارالشعور، اشاعت دوم ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۶

۱۵۔ منیر احمد، جنرل محمد یحییٰ خان-شخصیت وسیاسی کردار، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱

۱۶۔ Williams, L. F. Rushbrook, The East Pakistan Tragedy, London, Media Lane, 1972, P. 44

۱۷۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سقوطِ مشرقی پاکستان، محولہ بالا ا، ص ۱۲۶

۱۸۔ Brigadier Abdul Rahman Siddiqi, East Pakistan: The End Game, Karachi,

Oxford University Press, 2004, P. 81

۱۹۔ توصیف احمد خان، آدھا پاکستان، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۴ء، ص ۷۸

۲۰۔ منیر احمد خان، جنرل محمد یحییٰ خان۔شخصیت و سیاسی کردار، محولہ بالا ۱۵، ص ۱۶۴

۲۱۔ شیخ افتخار علی، پاکستان توڑنے والے، لاہور تخلیقات، ۱۹۹۷ء، ص ۳۵۲

۲۲۔ K. K. Aziz, World Powers and the 1971 Breakup of Pakistan, Lahore, Vanguard, 2003, P. 36

۲۳۔ Hassan Zaheer, The Separation of East Pakistan, Karchi, Oxford, University Press, 1994, P. 168.

۲۴۔ --do--, P. 169

۲۵۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، لاہور، مکتبہ داستان، ۱۹۹۰ء، ص ۵۷

۲۶۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ بالا ۷، ص ۲۴

۲۷۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۵

۲۸۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ ۷، ص ۲۴

۲۹۔ Siddiq Salik, Witness to Surrender, Karachi, Oxford University Press, 1977, P. 3

۳۰۔ فاروق عادل، ''آنکھوں نے جو دیکھا''، لاہور، ماہنامہ ''فنون''، جولائی اگست ۱۹۷۰ء، ص ۵۱، ۵۰

۳۱۔ جنرل ایوب خان، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، لاہور، آکسفورڈ پریس، س۔ن، ص ۳۰۹

۳۲۔ ڈاکٹر صفدر محمود، سقوطِ مشرقی پاکستان، محولہ بالا ۱، ص ۱۲۶

۳۳۔ مسعود شہریار، مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۴

۳۴۔ پروفیسر ہارون الرشید، ''سابق مشرقی پاکستان میں اردو ادب۔ایک اجمالی جائزہ''، لاہور، ماہنامہ ''سیارہ''، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۳۲

۳۵۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز، محولہ بالا ۱۴، ص ۳۹

۳۶۔ ایضاً، ص ۷۱، ۷۰

۳۷۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ بالا ۷، ص ۲۰

۳۸۔ Herberd Feldman, The End and Beginning of Pakistan 1969-1971,

London, Oxford University Press, 1976, P. 39

۳۹۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز، محولہ بالا۴۳، ص ۲۲۲

۴۰۔ محمود الرحمٰن، سونار بنگلہ، لاہور، ادارہ افکارِ نو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۵

۴۱۔ سعید الدین، مشرقی پاکستان کا زوال، محولہ بالا۴۱، ص ۴۸

۴۲۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، جلد اول، مترجم: سید فضیل ہاشمی، اشفاق خان، مرتضیٰ انجم، لاہور، دار الشعور، ۲۰۰۶ء، ص ۸۱

۴۳۔ منیر احمد شیخ، ''پاکستان میں قومی تشخص کا بحران''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴ء، ص ۸۱

۴۴۔ A. M. K. Maswani, Subversion in East Pakistan, Lahore,

Amir Publications, 1979, P. 105

۴۵۔ انور رضا، یادوں کے جھروکے، اسلام آباد، پکٹوریل پرنٹرز، ۱۹۷۶ء، ص ۷۷

۴۶۔ اُمِ سلمٰی، سقوطِ ڈھاکہ کے نظریاتی اسباب، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اسلامیات،

پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱

۴۷۔ بشیر منصور، ''سانحۂ مشرقی پاکستان میں اساتذہ کا کردار''، لاہور، ماہ نامہ ''افکارِ معلم''، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۴۱

۴۸۔ سعید الدین، مشرقی پاکستان کا زوال، محولہ بالا۴۱، ص ۴۸

۴۹۔ خالد جاوید احمد، اردو شاعری پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو،

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰

۵۰۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز، محولہ بالا۴۳، ص ۱۸

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ G. W. Choudhury, The Last Days of United Pakistan, London,

C. Hurst and Company, 1974, P. 11

۵۳۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، محولہ بالا۲۵، ص ۱۰۴،۱۰۳

۵۴۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ بالا۷، ص ۴۲

۵۵۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان: تاریخ وسیاست ۸۸-۱۹۴۷ء، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰۲

۵۶۔ محمد فیاض، مشرقی پاکستان کی علیحدگی - عوامل ومحرکات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ مطالعہ پاکستان،

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۲۹

۵۷۔ Zulfiqar Ali Bhutto, The Great Tragedy, A Pakistan People's Party

Publication, III Edition, 1976. P. 52

۵۸۔ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ، جلد سوم، محولہ بالا ۴۲، ص ۲۲۸

۵۹۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ بالا ۷، ص ۱۹۰

۶۰۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان: تاریخ وسیاست ۸۸-۱۹۴۷ء، محولہ بالا ۵۵، ص ۲۰۲

۶۱۔ Syed Shabbir Hussain, The Death Dance, Islamabad, Kamran Publishing House, 1979, P. 67

۶۲۔ G.W. Choudhury, The Last Days of United Pakistan, P.8

۶۳۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، سانحۂ مشرقی پاکستان: تصویر کا دوسرا رُخ، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، اشاعت دوم ۲۰۰۶ء، ص ۳۵

۶۴۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، محولہ بالا ۲۵، ص ۲۹

۶۵۔ Fazal-e-Muqeem Khan, Pakistan Crisis in Leadership, Islamabad, National Book Foundation, Second Edition, 1973, P. 155

۶۶۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، سانحۂ مشرقی پاکستان: تصویر کا دوسرا رخ، محولہ بالا ۶۳، ص ۲۲۸

۶۷۔ جنرل گل حسن خان، آخری کمانڈر انچیف، مترجم: ڈاکٹر محمود الرحمان، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۷

۶۸۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، محولہ بالا ۷، ص ۲۱۹، ۲۱۸

۶۹۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، میں نے ہتھیار نہیں ڈالے، مرتب جاوید احمد صدیقی، کراچی، شبل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱

۷۰۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، سانحۂ مشرقی پاکستان: تصویر کا دوسرا رخ، محولہ بالا ۶۳، ص ۲۲۸

۷۱۔ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ، جلد سوم، محولہ بالا ۴۲، ص ۲۳۵

۷۲۔ مسعود مفتی، ''آخری ملاقات''، لاہور، سہ ماہی ''معاصر''، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۵۸، ۵۷

۷۳۔ اسعد گیلانی، پورب دیش، لاہور، مکتبہ الخیر، ۱۹۷۶ء، ص ۵

باب دوم

ناول پر اثرات

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے اردو کے نثری ادب میں ناول خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ ایک ایسا المیہ بن کر سامنے آیا جس کے لاتعداد پہلو تھے۔ ان پہلوؤں کو بیان کرنے کے لیے ناول کی صنف موزوں تھی کیونکہ اس صنف کے ذریعے ادیب زندگی کے مختلف پہلوؤں کو زیادہ بہتر انداز میں زیرِ بحث لا سکتا تھا۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی ناول کو انسانی زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ تفسیر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ناول کے فلسفیانہ پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ناول ایک زندہ اور ذی روح شے ہے۔ یہ زندگی کی تصویر ہی نہیں، تفسیر بھی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کی عام حقیقتوں کی سچائی ایک ایسے انداز میں ہوتی ہے جس نے ان کی سچائیوں کی عمومیت کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اپنی وسعت، گہرائی، تنظیم اور تفسیرِ حیات کی کوششوں کے ساتھ یہ اس عظمت کا مستحق ہے جو اس کو حاصل ہے۔''[۱]

عام طور پر ادیب اپنی تخلیق کے ذریعے کسی بڑے واقعے کے کسی ایک پہلو کو منکشف کر پاتے ہیں مگر ناول ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کے ذریعے ناول نگار نہ صرف مخصوص واقعہ بلکہ اس کے پس منظر اور پیش منظر کو تمام تر جزئیات سمیت بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ راشدہ قاضی ناول کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں اجتماعی اور خارجی زندگی کے حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ یوں تو فنونِ لطیفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اپنے ماحول اور سماجی عوامل سے بے نیاز رہ سکے مگر ناول حقائق کی جزئیات کا مشاہدہ پیش کرتا ہے جن سے ہم ان اسباب وعلل کا مکمل تجزیہ کر سکیں اور ان قدروں کے باہمی پیکار کو سمجھ سکیں جس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی متنوع انداز میں ہم پر منکشف ہوتی ہے۔''[۲]

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ناول پاکستانی معاشرے اور اس کے مسائل کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''پاکستانی ناول کا بنیادی رجحان قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کے معاشرتی، اقتصادی اور عمرانی مسائل اور پھر ان سے جنم لینے والے اجتماعی رویوں اور انفرادی المیوں پر مشتمل ہے۔''[۳] قیامِ پاکستان کے بعد سامنے آنے والے حالات وواقعات میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ ایک ایسے سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے جس سے صرفِ نظر کرنا قوم کے کسی فرد کے لیے ممکن نہیں چنانچہ ہمارے ناول نگاروں نے بھی اس موضوع کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور

مشرقی پاکستان کے طویل تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس سانحے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر اب تک کم وبیش دس ناول سامنے آئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے طارق اسماعیل ساگر کا ناول ''کمانڈو'' ۱۹۸۲ء میں ماہ نامہ ''پندرھویں صدی'' کراچی میں قسط وار چھپنا شروع ہوا۔ بعد ازاں یہ ناول ۱۹۹۰ء میں کتابی شکل میں سامنے آیا۔ اس دوران ۱۹۸۲ء میں طارق محمود کا ناول ''اللہ میگھ دے'' چھپ کر منظرِ عام پر آیا، جب کہ بھارت سے ظفر پیامی کا ناول ''فرار'' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھنے والے ناول نگاروں میں سے سلمیٰ اعوان، طارق محمود، رؤف ظفر اور جیون خان نے مشرقی پاکستان کے بحران کے ان دنوں کا براہِ راست مشاہدہ کیا اور اپنے جذبات واحساسات کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔ یہ ناول، ان ناول نگاروں کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کے عکاس ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے بقول:

> ''ہر ناول زندگی کا ایک تجربہ پیش کرتا ہے۔ یہ تجربہ ہی ناول کا مواد ہے مگر یہ مواد یا تجربہ ناول نگار کی ہستی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ تجربہ ناول نگار کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدات والہامات کو یکجا کر کے ہی ناول بناتا ہے۔''[۳۹]

ان چار ناول نگاروں نے ذاتی مشاہدات پر ناول کی بنیاد رکھی جب کہ اس موضوع پر لکھنے والے باقی ناول نگاروں نے مطالعے کو ناول کی بنیاد بنایا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے پر لکھے گئے ناولوں میں سے سلمیٰ اعوان کا ''تنہا''، الطاف فاطمہ کا ''چلتا مسافر''، رضیہ فصیح احمد کا ''صدیوں کی زنجیر'' اور انتظار حسین کا ''بستی'' قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کے حالات وواقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلے تین ناولوں کا مرکزی موضوع سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ ہے جب کہ قیامِ پاکستان کے دور کا ذکر اس سانحے کا پس منظر واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے جب کہ ''بستی'' میں قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان تک کے حالات و واقعات ایک توازن کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ان ناول نگاروں نے قیامِ پاکستان کے دوران اہلِ بنگال کا جوش وخروش، قیامِ پاکستان کے بعد ان کی توقعات اور لسانی، معاشی اور سیاسی حوالوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لیا اور مختلف کرداروں کے ذریعے انھیں اس طرح قاری کے سامنے پیش کیا کہ قاری قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حالات سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناول جہاں تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہیں وہاں ان ناولوں کے ذریعے اس سانحے کے فرد کی ذاتی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بحران کے ان دنوں میں انسان تمام تر لبادے اتار کر سامنے آیا تو کہیں وہ فرشتہ نظر آیا تو کہیں شیطان۔ ناول نگاروں نے انسانوں کے ان رویوں

کا گہرا مطالعہ بھی ان ناولوں میں پیش کیا ہے ۔طارق محمود کا ناول ’’ اللہ میگھ دے‘‘ اور جیون خان کا ناول ’’دیپتی‘‘ مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کے حالات کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ بھی پیش کرتے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کا ایک اہم پہلو میدان جنگ کے حالات وواقعات پر مبنی ہے۔ نامساعد حالات میں پاکستانی فوج نے میدان جنگ میں جو کارنامے کئے وہ شکست کی دھول میں چھپ گئے ،کرنل (ر)رؤف ظفر کا ناول ’’ماتم شہرِ آرزو‘‘اور طارق اسماعیل ساگر کے ناول ’’کمانڈو‘‘ اور’’لہو کا سفر‘‘میدان جنگ کے حالات وواقعات کا مفصل جائزہ پیش کرتے ہیں۔ جب کہ طارق اسماعیل ساگر کا تیسرا ناول ’’وطن کی مٹی گواہ رہنا‘‘ایک پاکستانی جاسوس کی روداد پر مبنی ہے جو سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کے زمانے میں جاسوسی کی غرض سے بھارت میں داخل ہوتا ہے۔طارق اسماعیل ساگر چونکہ خود بھی بھارت میں جاسوسی کے فرائض انجام دے چکے ہیں اس لیے انھوں نے اس ناول کی روداد آپ بیتی کے انداز میں بیان کی ہے۔[۵]طارق اسماعیل ساگر نے تین ناولوں کے ذریعے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔بشیر احمد کے بقول’’طارق اسماعیل ساگر نے ایک ہی موضوع پر تین ناول لکھے۔اس سے موضوع کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔‘‘[۶]

سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں سے ’’تنہا‘‘،’’صدیوں کی زنجیر‘‘،’’چلتا مسافر‘‘ اور’’بستی‘‘ قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کے حالات کو پیش کرتے ہیں۔ان ناولوں میں حالات ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے پر منتج ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔الطاف فاطمہ نے ناول ’’چلتا مسافر‘‘ میں ایک ایسے خاندان کو موضوع بنایا ہے جو صوبہ بہار کا رہنے والا ہے اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہے ۔ناول کی پہلی فصل میں قیامِ پاکستان سے پہلے پیش آنے والے حالات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کے لیے اس علاقے کے لوگوں کی قربانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جب کہ دوسری فصل میں مشرقی پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک بہاریوں پر گزرنے والے حالات اور ان کے جذبات واحساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔

انتظار حسین نے ناول ’بستی‘‘ میں قیامِ پاکستان کے ان دنوں کا تذکرہ کیا ہے جب ابھی مسلمان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آرہے تھے۔ان کے دل میں امیدیں بھی تھیں،ایک دوسرے کے لیے قدیم مروت کے جذبے اور وضع داری کا احساس بھی نمایاں تھا مگر آہستہ آہستہ یہ جذبات ماند پڑتے گئے اور ان کی جگہ جائداد کی ہوس نے لے لی۔ناول میں بیان کردہ حالات وواقعات کا منطقی انجام سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔سراج منیر کے بقول اس ناول میں ’’مشرقی پاکستان کا زوال ایک استعارہ بن کر اپنی ساری خوش فہمیوں اور طفل تسلیوں کے ساتھ،سن ستاون کے ساتھ اور اس سے بھی آگے تک کی چھوٹی چھوٹی علامتوں کی ایک پوری لڑی پروتا جاتا ہے۔‘‘[۷]ناول کا زمانی کینوس قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان کے دور پر محیط ہے۔شہزاد منظر کے بقول:

''ناول برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدو جہد سے شروع ہوتا ہے اور ہندو مسلم تنازع اور فرقہ وارانہ فسادات سے ہوتا ہوا قیامِ پاکستان، تبادلۂ آبادی، بھارت اور پاکستان میں جنگ، سقوطِ ڈھاکہ، سابق حکومت کے خلاف جدو جہد اور آخر میں غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر بشارت کی امید پر ختم ہو جاتا ہے۔''[۸]

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے بقول ''یہ ناول قیامِ بنگلہ دیش، ہندو پاک کے مہاجرین کے درد و کرب، ان کی نفسیاتی الجھنوں، تہذیبی شکست و ریخت، آبادی میں ویرانی کا احساس اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں تباہی و بربادی پر محیط ہے۔''[۹] قرۃ العین کا ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' بھی ہندوستان کی جنگ آزادی سے لے کر مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی تحریک کے زمانی کینوس پر محیط ہے۔ تاہم اس کا غالب حصہ زمانی اعتبار سے سقوطِ مشرقی پاکستان سے پہلے کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔

سلمیٰ اعوان نے ''تنہا'' میں ۱۹۴۷ء کے دور میں بنگال کے ماحول کی عکاسی کی ہے اور پاکستان کے بارے میں بنگالیوں کی توقعات کا ذکر کیا ہے مثلاً ناول کا ایک کردار اجتبیٰ الرحمان پاکستان کے بارے میں اس طرح سوچتا ہے کہ ''جب پاکستان بن جائے گا تو بیماروں کو ہسپتال میں داخلہ ملے گا ناں، ان کا علاج توجہ سے ہوگا ناں۔''[۱۰] ان حالات میں جب پاکستان وجود میں آجاتا ہے تو مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ مختلف ناول نگاروں نے اس موقع پر لسانی حوالے سے سامنے آنے والے حالات و واقعات کا مختلف پہلوؤں سے تجزیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ناول نگاروں کا عمومی رویہ یہی نظر آتا ہے کہ حکومت کو زبان کے مسئلے پر سختی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا بلکہ یہ مسئلہ افہام و تفہیم سے حل کرنے کی ضرورت تھی اور اس حوالے سے بنگالیوں کے جذبات کا احساس کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ جاننے اور سمجھنے کی ضرورت تھی کہ اہل بنگال کو بنگلہ سے کس قدر محبت ہے اور وہ اس زبان کو اپنی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ طارق محمود ناول ''اللہ میگھ دے'' میں بنگلہ کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے اسے بنگالیوں کا ثقافتی ورثہ قرار دیتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار بنگلہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''بنگالی (زبان) پانچ کروڑ مسلمانوں کا ایک ایسا ثقافتی ورثہ تھا جو ان کے معاشرتی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ زبان چھ صدیوں تک مسلمانوں کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی، انسانیت اور تصوف کے اصولوں کی امیں رہی، انسان کو کائنات اور قدرت کی ہستی سے مربوط کیا، اس کا خمیر یہاں کے سبزہ زاروں، دریاؤں کی لہروں سے اٹھا، اس میں دھان کی خوشبو اور مچھلی کی باس تھی، مسلم شعور اور مسلم تشخص کی علامت بنی۔''[۱۱]

حکومتِ پاکستان نے جب اردو کے واحد قومی زبان ہونے کا اعلان کیا تو اس کے جواب میں اہلِ بنگال

سراپا احتجاج بن گئے۔ ڈھاکہ کی سیاسی فضا کشیدہ ہوگئی اور بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک خاصا زور پکڑ گئی۔ ان ہی تلخ حالات میں قائداعظم نے بنگال کا دورہ کیا اور وہاں اردو کے واحد قومی زبان ہونے کے اعلان کا اعادہ کیا۔ اہلِ بنگال کے دلوں میں قائداعظم کے لیے محبت کا جو جذبہ موجود تھا، اس کے باعث لوگ ان کی بات سن کر خاموش ہوگئے، مگر انھیں یہ بات پسند نہ آئی۔ اس موقع پر ناول ''تنہا'' کا ایک کردار بنگالیوں کے جذبات کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

''حیدر علی! عظیم قائد نے یہ کیسا حکم دے دیا ہے۔ ہم تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ضرور ہیں پر ہماری زبان وسیع علمی اثاثہ کی مالک ہے۔ اس کی موت تو بنگال کی تہذیب وثقافت کی موت ہوگی۔''[۱۲]

بنگلہ کو قومی زبان قرار دلوانے کی تحریک ایک دفعہ تو دب گئی مگر کچھ عرصے بعد ہی اس تحریک نے دوبارہ سر اٹھالیا۔ حکومت نے اس تحریک کو طاقت سے دبانے کی کوشش کی تو حکومت اور مظاہرین کے درمیان محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ ناول ''تنہا'' میں اس موقع پر نئی اور پرانی نسل کے لوگوں کے درمیان خیالات کے تضاد کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

''اور تباہی کے بغیر حصولِ مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی دادو۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ سر کٹتے ہیں، خون بہتا ہے، تب کہیں جا کر کامیابی کا دامن ہاتھ آتا ہے۔''

''مجھے تمھاری رائے سے اتفاق نہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ یہ حکومت ہماری اپنی ہے۔ ہم پرسکون طریقے سے بھی اپنا مطالبہ منوا سکتے ہیں۔''

''میں پوچھتا ہوں تو پھر یہ مطالبہ مان کیوں نہیں لیا جاتا۔ کتنے سال ہوگئے ہیں تحریک کو چلے ہوئے۔ یہ پکڑ دھکڑ، سنسناتی گولیاں یہ سب کس لیے ہیں، آپ کتنی معصوم باتیں کرتے ہیں۔''[۱۳]

ناول ''تنہا'' کے واقعات وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء کے آئین میں حکومت نے اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا۔ اس موقع پر سلمیٰ اعوان نے ناول کے ایک کردار اجتبیٰ الرحمان کے ذریعے بنگالیوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''جاتی بہار کے اس حسین شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوب صورت ماں اس کے سامنے سٹول پر بیٹھی ہونٹوں پر مسرور مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت نے بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دے دیا تھا۔''[۱۴]

''تنہا'' کے علاوہ اکثر ناول فسادات کے ان دنوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جب مشرقی پاکستان میں علاحدگی کی تحریک پروان چڑھ چکی تھی جبکہ ''تنہا'' آغاز سے لے کر انجام تک ان تمام حالات وواقعات کو بتدریج قاری کے

سامنے لاتا چلا جاتا ہے جو اس سانحے کا باعث بنے۔ بانو قدسیہ ناول ''تنہا'' کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''اردو ادب میں غالباً یہ واحد ناول ہے جس نے کہانی کے پیرائے میں ان تمام الزامات، نظریات اور جذبات کو پرت پرت کھولنے کی کوشش کی ہے جو مغربی پاکستان سے بچھڑنے سے پہلے بنگالیوں اور پاکستانیوں کے دماغوں کو نشے کی طرح چٹ کر گئے اور جن کے باعث افہام وتفہیم کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔'' ۱۵؎

حقیقت یہ ہے کہ زبان کے مسئلے نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر ایک نئے احساس کو جنم دیا اور وہ قومی دھارے سے کٹ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے موضوع پر لکھنے والے اکثر ناول نگاروں نے اس لسانی مسئلے پر زیادہ توجہ نہیں دی بلکہ ان کی زیادہ توجہ بحران کے آخری دنوں پر رہی البتہ سلمیٰ اعوان نے اپنے ناول ''تنہا'' میں اس مسئلے کے تمام تدریجی مراحل قاری کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں بنگالیوں کی شرکت نہایت کم تھی جس کے سبب مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان سے افسران کی تعیناتی کی گئی۔ بدقسمتی سے ان افسران کی ایک تعداد نے وہاں جا کر ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ اہلِ بنگال خود کو محکوم اور مغربی پاکستان کو حاکم تصور کرنے لگے۔ ہمارے ناول نگاروں نے اس مسئلے کا تجزیہ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ان افسران کے رویوں اور ان کے بارے میں بنگالیوں کے جذبات کا اظہار نہایت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ ناول ''تنہا'' کا مرکزی کردار اجتبیٰ الرحمان ایک موقع پر ڈی۔سی صاحب کے پاس اپنے دادو کی دوا کے لیے مدد طلب کرنے جاتا ہے تو ان کے تلخ رویے کا شکار ہو جاتا ہے، جس سے اس کے اندر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔

''ٹھہرو! اس کی کرخت آواز نے اسے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔'' ''کون ہو تم؟'' بے زاری سے پوچھا گیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اسے وہاں آنے کا مقصد بتایا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے، نکمے ذلیل لوگ، مانگنے کے سوا تم لوگوں کو اور بھی کچھ آتا ہے۔''

''میں مانگنے نہیں آیا'' اس کڑے وار کو وہ برداشت نہ کر سکا تھا، تلملاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''تو اور کیا کرنے آئے ہو۔ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اس سست ذلیل قوم نے۔'' ۱۶؎

اسی طرح ''صدیوں کی زنجیر'' میں ایک کردار مغربی پاکستانی افسروں کے رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ''مغربی پاکستانی افسروں کا رویہ وہی ہے جو انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ تھا۔'' ۱۷؎ مغربی پاکستانی افسروں کے اس رویے نے مشرقی پاکستانیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مغربی پاکستانی انھیں اس قابل خیال ہی نہیں کرتے کہ ملک کے

نظم و نسق میں شامل کیا جائے۔ ناول ''تنہا'' کا ایک کردار مغربی پاکستانیوں کی اس سوچ کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔

''تمھارا دل لرزتا ہے جب ہمارے باغیانہ خیالات تم پر ظاہر ہوتے ہیں، تم کانپ جاتی ہو جب ہم علاحدگی کا نعرہ لگاتے ہیں، یہ سب تمھیں سمجھانا بہت مشکل ہے کہ ایسا کیونکر ہوا، ہمیں بھی اس ملک سے محبت تھی، ہم نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی، اس سے ہم نے بھی بہت توقعات وابستہ کی تھیں، پر حالات نے ہمیں یہ سمجھایا کہ ہم سازشی ہیں، اول درجے کے کاہل، نااہل اور نکمے ہیں، ہم میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ہم شورش پسند اور فتنہ پرور ہیں۔'' ۱۸

مغربی پاکستان کا وہ اعلیٰ طبقہ جسے اس زمانے میں مشرقی پاکستان میں وقت گزارنے کا موقع ملا، انھوں نے بنگالیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کے بجائے خود کو ان سے برتر خیال کیا، جس کے نتیجے میں دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون بنگالیوں کے بارے میں اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کرتی ہوئی کہتی ہے۔

''اللہ کا شکر ہے، میری آیا تو اردو سپیکنگ ہے، ورنہ کون سر مارتا امارتمارسے، پھر یہ گندے بھی بڑے ہوتے ہیں بنگالی۔ ذرا دیکھو تو، کتنی سڑی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، پاس ہی جوہڑ ہوتے ہیں۔ مکھی، مچھر اور چنگڑی ماچھ، بس یہی ہے ان کا مقدر۔'' ۱۹

مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کے ان خیالات نے مشرقی پاکستانیوں کے لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بو دیے جس کے نتائج علاحدگی کی صورت میں سامنے آئے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تمام مغربی پاکستانیوں کا رویہ اس نوعیت کا نہ تھا۔ ناول نگاروں نے اس مسئلے کو بیان کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اس مخصوص طبقے کا ذکر زیادہ نمایاں انداز میں کیا ہے جو خود کو اشرافیہ اور بنگالیوں سے بلندتر خیال کرتے تھے مگر اس کے ساتھ یقیناً ایسے محبِ وطن مغربی پاکستانیوں کی تعداد بھی موجود تھی جن کے دل اس نوع کے تعصبات سے پاک تھے، ان کے لیے مغربی یا مشرقی پاکستانی کی تفریق بے معنی تھی اور ان کے دل صرف پاکستان کی محبت میں سرشار تھے مگر ہمارے ناول نگاروں نے ایسے مغربی پاکستانیوں کا ذکر نہیں کیا جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کا ہر فرد خود کو مشرقی پاکستانیوں سے بلندتر خیال کرتا تھا۔ اگر ایسے محبِ وطن لوگوں کا تذکرہ بھی سامنے آجاتا تو مستقبل کے قاری پر یہ بات واضح ہو جاتی کہ مشرقی پاکستانیوں کے لیے نفرت کے یہ جذبات ہر مغربی پاکستانی کے دل میں موجود نہ تھے اور یوں ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے آجاتی۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں کے اندر جنم لینے والے احساس محرومی کا ایک بڑا سبب دونوں حصوں کے درمیان اقتصادی تفاوت تھا۔ دراصل بنگال میں قیامِ پاکستان سے پہلے ہی ہندو معیشت پر چھائے ہوئے تھے اور قیامِ پاکستان کے

بعد بھی ان کا یہ غلبہ جاری رہا جب کہ دوسری طرف اہل بنگال قیامِ پاکستان کے بعد اپنی مالی حالت کی فوری بہتری کی توقعات لگائے ہوئے تھے۔ان حالات میں جب پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے اہلِ بنگال کے حالات بہتر بنانے کے لیے کوئی بڑی کوشش بھی سامنے نہ آئی تو ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا کہ بنگال کی تمام تر دولت مغربی پاکستانیوں نے غصب کر رکھی ہے اور وہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔''تنہا'' میں ناول نگار نے بنگالیوں کی عسرت کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''آج عید کا دن تھا۔شاذ ہی کسی بچے کے تن پر نیا کپڑا تھا۔کلبل کلبل کرتے درجنوں بچے، راکھ سے مچھلی صاف کرتی ہوئی میلی کچیلی عورتیں اور پوکھر میں نہاتے ہوئے کمزور کمزور مرد۔''[۲۱]

''اللہ میگھ دے'' میں ایک علاحدگی پسند سیاسی جماعت کا کارکن بنگالیوں کی اس غربت کا ذمہ دار مغربی پاکستانیوں کو ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''ہمارے منہ سے نوالہ چھیننے والو، ہم تمھارے منہ سے نوالہ اگلوائیں گے۔سونار بنگلہ کی دولت لوٹنے والو، تمھارے حساب کے دن قریب ہیں۔بنگال کی قسمت سے کھیلنے والو، تمھاری جاہ کی بنیاد ہمارے خون پر رکھی گئی ہے۔اب یہ جوش کھا رہا ہے۔بھوک اور افلاس اب ہمارا مقدر نہیں، بنگال جاگ اٹھا ہے۔''[۲۲]

اسی طرح ''ماتمِ شہرِ آرزو'' کا ایک کردار رحمان اپنی غربت کا رونا روتا اور جی بھر کر مغربی پاکستان کے باشندوں کو کوستا جو بقول اس کے بنگالیوں کی مفلوک الحالی کا باعث تھے[۲۳]ان ناولوں میں جہاں بنگالیوں کی معاشی صورت حال کا نمایاں ذکر ملتا ہے وہاں صدرِ پاکستان محمد ایوب خان کی طرف سے کیے گئے ان اقدامات کا حوالہ بھی ملتا ہے جو انھوں نے بنگال کی اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کیے۔''اللہ میگھ دے'' کے دو کردار عمر اور ابوالقاسم اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

> ''مشرقی حصہ کو مغربی پاکستان کے برابر لانے کے لیے اب تو شعوری کوششیں کی جارہی ہیں۔صورتحال اس قدر دگرگوں بھی نہیں۔''
>
> کیسی کوششیں؟ ابوالقاسم بلند آواز میں بولے۔
>
> تیسرے پنج سالہ منصوبے میں اس بات کا مداوا کیا جا رہا ہے۔مغربی پاکستان میں اصل بریک تھرو نجی شعبہ کی بناء پر ہوا ہے۔اس بار اس شعبے کو دونوں صوبوں میں یکساں اہمیت دی جارہی ہے۔''[۲۴]

مشرقی پاکستانیوں کا احساس محرومی محض اقتصادی پہلو سے نہ تھا بلکہ یہ ہمہ پہلو تھا۔اس صورت حال میں زیادہ شدت سیاسی حالات نے پیدا کردی۔قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی میدان میں پے در پے ایسے واقعات سامنے آئے کہ بنگالی بجا طور پر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ پاکستان میں اقتدار کے ایوانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ہمارے اکثر ناول نگاروں نے اس صورتحال کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور بنگالیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔''اللہ میگھ دے'' کا ایک کردار ڈاکٹر عزیز ملکی سیاست میں بنگالیوں کے مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔''ملک کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔اس وقت تک کا ریکارڈ کیا گواہی دیتا ہے۔قیامِ پاکستان کے بعد ملکی سیاست میں بنگال کا کردار محض عضو معطل بن کر رہ گیا ہے۔''[۲۵] ''صدیوں کی زنجیر'' کا ایک کردار بنگالیوں کے اندر پیدا ہونے والے تحریک علاحدگی کے جذبات کو اسی سیاسی محرومی کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔

''سوال تو یہ ہے کہ جب پاکستان بنگالیوں کی مرضی اور حمایت سے بنا تھا تو وہی اس کو توڑنے پر تیار کیسے ہوئے؟''

''اس طرح کہ انھیں یہ احساس ہوا یا دلایا گیا کہ پہلے انھیں ہندوؤں نے کچلا پھر انگریزوں نے جی بھر کر دبایا۔پاکستان بننے کے بعد اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کرنے کا حق ان کا تھا۔آپ نے وہ حق انھیں نہیں دیا تو انھوں نے دوسرا حق استعمال کیا۔''[۲۶]

''تنہا'' کا ایک کردار فخر متحدہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''بائیس سالوں نے ہمیں کیا دیا۔اقتصادی بدحالی،سیاسی حق سے محرومی،فوجی آمریت کے شکنجے نوکر شاہی،اب بھی آپ کہتی ہیں سومی آپا کہ حقائق پر جذبات غالب آگئے ہیں۔یہاں تو حقائق اتنے کڑوے ہیں کہ زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے۔''[۲۷]

متحدہ پاکستان کی بائیس سالہ تاریخ میں کئی ایک واقعات اس طرح سامنے آئے کہ بنگالی ہر معاملے کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔۱۹۶۴ء میں پاکستان،ایران اور ترکی کے درمیان علاقائی تعاون برائے ترقی (Regional Co-Operation for Development) نامی تنظیم وجود میں آئی۔''اللہ میگھ دے'' میں ناول نگار اس تنظیم کے متعلق بنگالیوں کے تاثرات ڈاکٹر عزیز اور عمر نامی دو کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

''تم ہی بتاؤ،اس تنظیم کا بھلا مشرقی پاکستان کو کیا فائدہ؟ آخر پاکستان سے مراد محض مغربی پاکستان ہی تو نہیں۔ہر چیز کو وہاں کے اینگل سے دیکھا جاتا ہے۔تجارت،منصوبہ بندی،دفاع اور دفاعی حکمت عملی اور پھر یہ سب کچھ پاکستان کے نام پر کیا جا رہا ہے،ایسا پاکستان جہاں (Policy Decision) میں ہمیں کوئی نہیں پوچھتا،میرے خیال میں کسی کو اس بات کا کبھی خیال بھی

نہیں آیا۔وہ عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا۔''۲۸

بنگالیوں کے ساتھ سیاسی اور معاشی میدان میں کی گئی زیادتیوں کا المناک مگر منطقی نتیجہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔انتظار حسین ایک کردار کے ذریعے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ تھا۔

''مولانا صاحب!یہ کیا ہو گیا؟''

ابا جان نے خواجہ صاحب کے رقت بھرے سوال کا جواب خشک لہجے میں دیا:

''خواجہ صاحب!یہ دنیا دار الحساب ہے۔انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔'' پھر خاموشی سے حقہ پینے لگے۔''۲۹

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناول جہاں اس المیے کا باعث بننے والے اسباب بیان کرتے نظر آتے ہیں وہاں ان ناولوں میں ہمیں بحران کے دنوں کی پوری تاریخ بھی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ایک مضمون ''ناول کی عظمت'' میں اوسکر وائلڈ کے ایک قول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ میں ناموں کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہوتا ہے جبکہ ناول میں محض نام ہی جھوٹ ہوتے ہیں۔۳۰ ہم دیکھتے ہیں کہ ان ناولوں میں بھی یہی صورت حال موجود ہے۔ان ناولوں کے مطالعے سے قاری جہاں سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر اور اس کے اسباب وعلل سے آگاہی حاصل کرتا ہے وہاں بحران کے ان دنوں کی تمام تر تفصیلات بھی اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ان ناولوں میں متحدہ پاکستان کے آخری چند سالوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں کہ ان دنوں مشرقی پاکستان میں لاقانونیت کس درجے پر پہنچ چکی تھی اور متحدہ پاکستان کے حامیوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جارہا تھا۔یہ ناول ان دنوں کے مشرقی پاکستان کی تاریخ اور بنگالیوں کے سوچنے کے انداز قاری کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ ''صدیوں کی زنجیر'' میں ناول نگار نے ایک سیاسی جلسے کی عکاسی کی ہے جس سے وہاں کی سیاسی فضا اور بنگالیوں کے اندازِ فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''بعض اوقات جے بنگلہ کے ساتھ ساتھ جے پاکستان کے نعرے بھی سننے میں آتے ہیں۔اب ان نعروں کا وقت گزر چکا ہے۔ایسے نعرے فی الفور بند کیے جائیں۔۔۔''مکل کی تقریر پر بے پناہ تالیاں بجیں اور فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔''۳۱

یحییٰ خان نے حکومت سنبھالتے ہی ملک کے دونوں حصوں میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا تو مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم علاقائی تعصب کی بھرپور فضا میں مزید اضافے کا باعث بنی۔''کمانڈو'' میں ناول نگار نے انتخابات کے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ان دنوں انتخابات کی تیاریاں زوروں پر تھیں،سیاسی ہلڑ بازی اپنے عروج پر تھی اور سیاسی اجتماعات میں ایسے ایسے نعرے سنائی دے رہے تھے کہ جو کبھی وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔''۳۲

ان انتخابات کے نتیجے میں جب مجیب الرحمان کو پورے مشرقی پاکستان میں شاندار کامیابی ملی تو وہاں علاحدگی کی تحریک نے شدت اختیار کرلی۔

''انتخابات ہو چکے تھے اور حسب توقع کامیابی نے علاحدگی پسندوں کے قدم چومے تھے۔نفرت کی فصل پک کر کٹنے کی منتظر تھی۔''سنگرام۔سنگرام''،''امارا دیش۔بنگلہ دیش''،''امار نیتا۔بنگلہ بندھو''اوراس قسم کے دوسرے سفاکانہ نعروں سے شہر کے در و دیوار لرزنے لگے۔''۳۳

ان انتخابات کے بعد جنرل یحییٰ خان اور ملک کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں، پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان اقتدار کی جو رسہ کشی ہوئی ،ان ناولوں میں ان حالات وواقعات کا مفصل بیان ملتا ہے۔بعض ناول نگار ان حالات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ ناول، ناول کے بجائے تاریخ کی کتاب میں بدل کر اپنے اصلی مقام سے ہٹ جاتا ہے۔ناول نگار کو تاریخ کے یہ اوراق محض پس منظر کے اجاگر کرنے کی غرض سے بیان کرنے چاہئیں اور اگر ناول نگار اس کا خیال نہ رکھے تو ناول، ناول سے زیادہ تاریخ معلوم ہونے لگتا ہے جس کے سبب ناول کے کردار، پلاٹ اور تخلیقی عنصر متاثر ہوتے ہیں۔شہزاد منظر کے بقول ''ناول میں تاریخ کو پیش کرنا کوئی عیب نہیں لیکن اس کے لیے تاریخ اور ناول کے پلاٹ یعنی قصے کو قدم بہ قدم بڑھنا چاہیے۔اگر ایسا نہ ہو تو ناول، ناول نہ رہے گا تاریخ بن جائے گا۔''۳۴ بعض ناول نگار صفحات کے صفحات پر اس دور کے حالات وواقعات اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ اصل کہانی کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔اس حوالے سے ''ماتمِ شہرِ آرزو'' کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔اس میں ناول نگار نے مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کی تمام تر کارروائی خود ساختہ مکالموں سمیت بیان کردی ہے۔ناول کے اصل کردار درمیان سے غائب ہو جاتے ہیں اور کئی کئی صفحات پر حقیقی کرداروں کا ذکر چلتا رہتا ہے جس کے سبب ناول اپنے مقام سے ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔بشیر منصور ناول کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بنگال کے عام سیاسی حالات اور سیاسی مذاکرات کو خاصی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔یہ تفصیل بعض مقامات پر بہت زیادہ طوالت اختیار کر لیتی ہے اور ناول کے کردار نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔''۳۵

تاریخی ناول ہونے کے ناطے یقیناً یہ حالات وواقعات بیان کرنا بھی ضروری تھے مگر انھیں مختصر اور فن کے پیرائے میں اس

طرح ڈھال کر پیش کیا جا سکتا تھا کہ ناول کی تخلیقی حیثیت متاثر نہ ہو۔

۱۹۷۱ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں لاقانونیت بڑھتی گئی تو حکومت کو فوج کے ذریعے باغیوں کی سرکوبی کرنا پڑی۔ پاک فوج نے شرپسندوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کی۔ اس موقع پر فوج کے حوالے سے بنگالیوں میں اس نوعیت کی افواہیں پھیلائی گئیں کہ جیسے ان پر دشمن ملک کی فوج نے حملہ کر دیا ہو اور وہ ہر چیز کو تہس نہس کرتے چلے آرہے ہوں۔ ناول ''دیپتی'' میں ان حالات کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے۔

''آنے والے دنوں میں سرکاری فوجوں کی آمد آمد کا غلغلہ رہا۔ افواہ سازوں نے باور کرایا کہ پنجابی بڑی رفتار سے بڑھتے اور مقامی آبادی کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے چلے آرہے ہیں۔ جہاں مزاحمت ہوتی ہے وہاں توپ کے دہانے کھول دیتے ہیں۔ بے حساب انسان روئی کے گالوں کی طرح دھنے چلے جاتے ہیں۔ گھروں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔''۳۶

اسی ناول میں اس صورت حال کے حوالے سے مزید بیان کیا گیا ہے۔ ''افواہیں وبا کی طرح پھیلتی گئیں۔ ان کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے باور کر لیا کہ فوج کے روپ میں انسان نہیں خونخوار بھیڑیے بڑھے چلے آرہے ہیں۔''۳۷ فوج نے کارروائی کر کے حالات پر قابو پا لیا مگر اس دوران فوج سے ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جو ان کی بدنامی کا باعث بنیں۔ ''لہو کا سفر'' میں مرکزی کردار اس فوجی آپریشن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ایک پاکستانی ہونے کے ناطے مجھے احساس تھا کہ ان حالات میں یہ آپریشن ناگزیر تھا۔ فاسد مادہ الگ کیے بغیر، چیر پھاڑ کیے بغیر جسم کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ نشتر ضرورت سے زیادہ ہی گہرا چلا گیا ہے۔ جانے عملِ جراحت کی باریکیاں کیسے نظر انداز کر دی گئیں۔''۳۸

حمود الرحمٰن کمیشن سمیت دیگر تحقیقاتی رپورٹوں اور مختلف انٹرویوز کے ذریعے یہ بات منظر عام پر آچکی ہے کہ بعض مقامات پر پاکستانی فوجیوں نے ظالمانہ سلوک کیا جس کے نہایت برے نتائج سامنے آئے۔ ''صدیوں کی زنجیر'' میں ناول نگار ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''جس وقت میں کالا جھنڈا اتارنے اوپر گیا تھا تو میلو بھائی اوپر والے اسٹور میں کھڑکی کھولے شیشے سے باہر جھانک رہے تھے۔ میں بھی چپکے سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ سڑک پر رات کو ہم نے رکاوٹیں کھڑی کی تھیں ناں! تو وہاں ایک فوجی جیپ آکر رکی۔ اسی وقت ایک بہشتی پانی کی مشک لیے سڑک پار کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو کھڑا دیکھا تو گھبرا گیا اور مشک پھینک کر وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ فوجی اسے دیکھ چکے تھے یا نہیں، مجھے پتا نہیں مگر اب ایک سپاہی

اس کے پاس آیا ،اسے جوتے سے ٹٹولا اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔مشک بھی پھٹ گئی اور خون ملا پانی سڑک پر بہنے لگا ۔میلو بھائی نے غصے سے دیوار پر دو چار مکے مارے اور پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا،ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، کہنے لگے'' خدا کی قسم اب میں مکتی باہنی میں جاؤں گا اور واپس آ کر ان سے لڑوں گا۔اب کسی حالت میں یہ ملک ایک نہیں رہ سکتا۔'' ۳۹

پاکستانی فوج کے اس آپریشن کے نتیجے میں بڑی تعداد میں شر پسند اور کئی عام بنگالی بھی فوج کے ڈر سے بھارت چلے گئے تو بھارت نے ان مہاجرین کا خوب پروپیگنڈا کیا اور ان مہاجرین کے ذریعے بنگالیوں کو مظلوم اور مغربی پاکستان کو ظالم کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ناول ''لہو کا سفر'' میں اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے۔

''ہر اخبار اور رسالے میں بڑی بڑی تصاویر تباہ حال بنگالیوں کی سجائی گئی تھیں ۔بعض تصاویر تو دیکھ کر گماں گزرتا تھا جیسے یہ ماڈل ہوں یا پھر اداکار جنھیں ایسی تصاویر بنوانے کے لیے اچھا خاصا معاوضہ ادا کیا گیا ہو۔'' ۴۰

ان حالات میں بھارت نے مشرقی پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزیوں کا آغاز کر دیا اور مکتی باہنی کو ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر دی۔ ملک کے اندر مکتی باہنی اور سرحدوں پر بھارتی فوج مشرقی حصے کو مغربی حصے سے علاحدہ کرنے کے لیے آخری تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔''ماتمِ شہر آرزو'' میں ان حالات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' بنسی رام نے کہا'' لیکن اب ایسی منصوبہ بندی کرنا ہوگی کہ پوری بنگلہ قوم ضرورت پڑنے پر بیک وقت فوج پر ٹوٹ پڑے۔اس کے علاوہ ایسٹ بنگال رجمنٹ،ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے ساتھ رابطہ قائم کر کے انھیں بھی اس مقصد کے لیے تیار کرنا ضروری ہے۔''

''تمام ڈسٹرک ہیڈ کوارٹرز میں اسلحہ اور ہتھیار خاصی تعداد میں ذخیرہ کرنا شروع کر دو''۔مرلی دھر نے ہدایت کی۔''بھارت سے بہت سا اسلحہ آ چکا ہے اور بہت سا لانے کا منصوبہ ہے۔خفیہ طور پر سب میں یہ اسلحہ تقسیم ہونا چاہیے۔'' ۴۱

اس دور میں پاکستان توڑنے کی بھارتی سازشیں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں مگر پاکستانی حکمرانوں نے ان حالات کی سنگینی جانچنے کے لیے خاطر خواہ بصیرت کا ثبوت نہ دیا اور دشمنوں کے لیے حالات بتدریج سازگار ہوتے چلے گئے۔ طارق اسماعیل ساگر ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' میں جہاں بھارت کی ان سازشوں کا تذکرہ کرتے ہیں وہیں پاکستانی حکمرانوں

کی اس مسئلے کی طرف عدم توجہ کا رونا بھی روتے ہیں۔

''خان نے ملہوترہ کا بریف کیس ہر صورت اڑانا تھا کیونکہ اس میں اہم نوعیت کی میٹنگ کی تمام کاروائی درج تھی جو بھارت میں پاکستان کے خلاف پکنے والی کھچڑی پر مشتمل تھی۔ بھارت کو پاکستان توڑنے کا دیرینہ خواب پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔ تاریخ تیزی سے اپنی سمت بدل رہی تھی۔ ایک ان دیکھی تباہی پاکستان پر مسلط ہو رہی تھی اور ارباب بست وکشاد آنکھیں بند کیے چین کی بنسری بجا رہے تھے۔'' [۴۲]

ہمارے ناول نگاروں نے جہاں متعصب اور علاحدگی پسند بنگالیوں کا ذکر کیا ہے وہاں ایسے محب وطن بنگالیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو آخری دم تک متحدہ پاکستان کے حامی رہے اور اس کے لیے تکالیف اٹھائیں۔ ان محب وطن عناصر میں مختلف علاقوں، طبقوں اور سوچ کے افراد شامل تھے۔ یہ لوگ بنگلہ قومیت کی بجائے مسلم قومیت کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے۔ ان متحدہ پاکستان کے حامیوں میں وہ بہاری بھی شامل تھے جو پاکستان کی محبت میں ۱۹۴۷ء میں اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے تھے اور اب پاکستان ٹوٹنے کے عمل کو ذہنی طور پر قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ناول ''تنہا'' میں ایک ایسے ہی بنگالی ڈاکٹر کا ذکر کیا گیا ہے جو پاکستان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''ایسے طوفان ہر قوم کی زندگی میں آتے ہیں، پاکستان ایک ایسی اکائی ہے جو کبھی تقسیم نہ ہوگی۔'' [۴۳] ''صدیوں کی زنجیر'' میں شمس الرحمن علاحدگی کی تحریک کا مخالف نظر آتا ہے۔ ''ماتم شہر آرزو'' میں اس نظریے کے حامل کردار آزاد کے والد اور چچا کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ''کمانڈو'' میں طارق اسماعیل ساگر نے آنسہ اور اس کے گھر والوں کے حوالے سے تصویر کا یہی رخ پیش کیا ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان بنگالیوں کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''جو محب وطن بنگالی ہمارے لیے کام کر رہے تھے انھوں نے ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے جو ہماری بے حسی کی وجہ سے شاید تاریخ کا حصہ تو نہ بن سکیں لیکن ان کی یاد ہماری نسلیں کبھی نہ بھلا پائیں گی۔'' [۴۴]

''اللہ میگھ دے'' میں ایک بنگالی نوجوان حزب اللہ کا ذکر ملتا ہے جو محب وطن پاکستانی ہے۔ حزب اللہ ایک جلوس میں لگائے جانے والے بنگلہ قومیت کے نعرے سن کر سوچتا ہے۔ ''بنگلہ قومیت کا نعرہ انھیں پاکستان کی مین سٹریم سے بہت دور لے جا سکتا ہے اور ہم جیسے بنگالی، جن کا وجود پاکستان سے عبارت ہے، محض معلق روحیں بن جاتے ہیں۔'' [۴۵] ان ناولوں میں ملک کے دونوں حصوں کو متحد دیکھنے کی خواہش مند تنظیم ''اسلامی چھاترو شنگھو'' کی ان کوششوں کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے جو اس نے دونوں حصوں کو متحد رکھنے کے ضمن میں کیں۔ ''تنہا'' میں اس تنظیم کا تعارف اس انداز میں نظر آتا ہے۔

''میرے وطن کا یہ حصہ جو کبھی کبھی مجھے خود سے ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے، اسے قائم رکھنے کی جو جدوجہد یہ پارٹی کر رہی ہے، اس نے تو بہت پہلے مجھے اس سے متاثر کیا ہے۔''[۴۶] محب وطن تنظیموں ''البدر'' اور ''الشمس'' کا تذکرہ بھی ان ناولوں میں ملتا ہے۔ ''لہو کا سفر'' میں ناول نگاران کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''تقریباً تمام پلوں کی حفاظت البدر اور الشمس کر رہے تھے۔''[۴۷] ''تنہا'' کا مرکزی کردار سمیعہ علی، ''لہو کا سفر'' میں شیر افگن اور ''کمانڈو'' میں علی کا کردار ایسے محب وطن مغربی پاکستانیوں کی عکاسی کرتے ہیں جنھوں نے ملک کو متحد رکھنے کے لیے آخری دم تک قربانیاں دیں۔ ناول نگاروں نے علاحدگی پسند بنگالیوں کے ساتھ متحدہ پاکستان کے حامی بنگالیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ یوں تصویر کا ایک ایسا رخ بھی سامنے آ گیا ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان ناولوں میں محب وطن بنگالیوں اور مغربی پاکستانیوں کے علاوہ ان بہاریوں کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے جنھیں وطن کی سالمیت سے محبت تھی۔ ناول ''چلتا مسافر'' کا مرکزی کردار مزمل بہاری ہے جو پاکستان کی سالمیت کے لیے لڑتا ہوا شہید ہو جاتا ہے۔

اکثر ناول نگاروں نے بہاریوں اور متحدہ پاکستان کے حامیوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے مگر ظفر پیامی نے ''فرار'' میں ہمیں تصویر کا ایک اور پہلو بھی دکھایا ہے جس کے مطابق شہر میں ہونے والے فسادات کا ذمہ دار بہاریوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔

> ''شہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، شہر میں دھماکے بھی ہو رہے تھے، شاید کسی نے بم پھینک دیا، شاید کسی بارود خانے میں چنگاری بھڑک اٹھی، گویا اب بھی بہاریوں کی ستم رانی قائم ہے۔ غالباً شہر اب بھی رضا کاروں کی گرفت میں ہے۔ شہر میں جگہ جگہ اب بھی آگ لگی ہوئی ہے۔''[۴۸]

اسی طرح اس ناول میں ''البدر'' کا ذکر ان الفاظ میں نظر آتا ہے۔ ''ان علاقوں میں بہت سے رضا کار رہتے تھے۔ البدر کے ممبر۔ ان لوگوں نے بنگالی دانشوروں کو چن چن کر مارا، ان لوگوں نے ڈھاکہ کو جہنم بنا دیا۔''[۴۹] ناول میں مختلف مقامات پر یہ تاثر بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ پاکستانی فوجیوں اور متحدہ پاکستان کے حامیوں نے بنگالیوں کو بے دریغ قتل کیا۔ ایک صحافی لنڈا کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں۔

> ''لنڈا اولڈ فیلڈ نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے کیمسٹری لیب کے پیچھے ایک دو چار نہیں پوری دو تین سو لاشوں کو گن لیا۔ لنڈا اولڈ فیلڈ نے ان لاشوں کی تصویریں بھی لے لیں۔۔۔ وہ تصویریں مردوں، عورتوں، جوانوں اور بچوں کی۔ تصویریں ان بنگالی دانشوروں کی، جنھیں چن چن کر مارا گیا تھا۔''[۵۰]

فوجی کاروائی کے دوران پاکستانی افواج سے یقیناً کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جنھیں بڑھا چڑھا کر پیش

کیا گیا، بہر حال ناول ''فرار'' کے ذریعے قارئین تصویر کے اس پہلو کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔

حالات ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے قاری کو دسمبر تک لے آتے ہیں جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ ''صدیوں کی زنجیر'' میں ناول نگار تاریخ کے ان لمحات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''۲ اور ۳ دسمبر کی درمیانی شب رات کے دو بجے بموں کے دھما دھم سے لوگ چونک کر اٹھے۔ بھارتی حملے کا خطرہ تو سر پر منڈلا رہا تھا۔ مزید تصدیق بی۔بی۔سی سے ہو گئی جس نے چند منٹ کے اندر اندر پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ جانے کا اعلان کیا۔''[۵۱]

سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے اکثر ناول جنگ کی صورت حال کا بھی تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں فوجی جوانوں کے ان کارناموں کی بھی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں جو شکست کی دلدل میں ڈوب گئے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہمارے فوجیوں نے تمام تر بے سروسامانی کے باوجود میدان جنگ میں بہادری کے وہ کارنامے سرانجام دیے جن کی تعریف دشمنوں نے بھی کی۔ مگر اس پہلو پر کوئی بڑا ناول یا افسانہ تو گجا اس سانحے کے دیگر پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے بھی اس طرف کم توجہ دی گئی۔ غلام الثقلین نقوی کے بقول ''اس سانحے میں شجاعت کے جو کارنامے انجام پائے، وہ داستان کے روپ میں نہ آسکے۔ سوار محمد حسین شہید یا لانس نائیک محفوظ احمد شہید کے کارنامے کسی بہت بڑے افسانے یا ناول کا موضوع بن سکتے تھے۔''[۵۲] اس ضمن میں طارق اسماعیل ساگر کے تین ناول ''کمانڈو''، ''لہو کا سفر''، اور ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' بطور خاص اہم ہیں۔ طارق اسماعیل ساگر اور دیگر ناول نگاروں نے فوجی جوانوں کے ان جذبوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور قوم کے سامنے ان کی شجاعت اور بہادری کے ایسے واقعات پیش کیے ہیں جو شکست کے باعث سامنے نہ آسکے۔ ''کمانڈو'' میں ایک حوالدار حکم داد کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں۔

''ٹائیگر (حوالدار حکم داد) اپنی کچھار سے نکل کر ایڈوانس کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں پر لپکا۔ چشمِ فلک نے یہ نظارا کب دیکھا ہوگا؟ اس کی لپک، جھپٹ پر فرشتوں نے ''مرحبا، مرحبا'' پکارا، یہ جنگ نہیں تھی، اس طرح جنگیں نہیں لڑی جاتیں، یہ تو بڑھ کر موت کو اپنانے کی ادائیں تھیں۔''[۵۳]

طارق اسماعیل ساگر نے جنگ کے واقعات نہایت موثر انداز میں بیان کرتے ہوئے فوجی جوانوں کے جذبات کو الفاظ کا روپ دیا ہے۔ ہماری فوج کے اکثر جوانوں کا تعلق دیہاتی علاقوں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ عموماً کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ ان میں سادگی اور معصومیت کے جذبات بھرے ہوتے ہیں اور یہ لوگ لمبی چوڑی سوچ کی بجائے جذبوں سے کام لیتے ہیں۔ ''کمانڈو'' میں ایک ایسے فوجی جوان کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے جس کا ساتھی ایک معرکے میں شہید ہو جاتا ہے۔

''صاب فور دل میرا گرائیں تھا، ہم فوج میں اکٹھا بھرتی ہوا صاب، ٹریننگ بھی ایک ساتھ

کیا، کبڈی بھی اکٹھا کھیلا، زندگی بھرا کٹھا رہا ہے سر۔ اب وہ اگلا جہان میں اکیلا کیسے جائے گا صاب۔ کل ہم خدا کی عدالت میں اس کو کیا منہ دکھائیں گے صاب، ہم اپنا سنگی کو موت کی راہ پر اکیلا نہیں جانے دے گا سر! خدارا ہمیں معاف کر دینا۔ ادھر ہمارے گاؤں کے لوگوں کو بولو کہ ہم نے یاری نبھا دیا۔'' ۵۴؎

پاک فوج کے سپاہیوں نے اس جنگ میں بہادری کے جو کارنامے سرانجام دیے ان سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حالات اس قدر نامساعد تھے کہ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کے ایک کردار کے بقول ''انھوں نے اپنے پھٹے پرانے جوتے پھینک کر مردہ دشمنوں کے پیروں سے موزے اور جوتے اتار کر پہنتے دیکھا تھا۔'' ۵۵؎ ان نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے دشمن کا اس طرح مقابلہ کیا کہ دشمن کو پیش قدمی میں نہایت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ''دہپتی'' میں جنگ کا احوال ان الفاظ میں ملتا ہے۔ ''پاک بھارت جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھارت کی فوجیں پیش قدمی کر رہی تھیں مگر ان کے لاتعداد سپاہی کٹ رہے تھے۔'' ۵۶؎ طارق اسماعیل ساگر کے بقول ''اس جنگ میں فلک نے مجاہدین کی عظمتوں کے وہ نظارے دیکھے جن کی نظیر تاریخ عالم میں مشکل سے دکھائی پڑتی ہے۔'' ۵۷؎ اس جنگ میں مشرقی کمان کو اس غلط فہمی میں رکھا گیا کہ پاکستان کے دوست ممالک بہت جلد ان کی مدد کو پہنچنے والے ہیں مگر آخری دم تک یہ ممکن نہ ہوا۔

''۱۰ سے ۱۳ دسمبر تک چین اور امریکہ کی مدد کی آس کا ایک ایسا وقت ضرور آیا تھا جب پاکستان کا عام شہری اور سپاہی ہی نہیں، دانش ور، سیاست دان، فوجی افسر یہاں تک کہ ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر جنرل نیازی بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رکھے گئے کہ دوستوں کی مدد اب آئی کہ آئی۔'' ۵۸؎

ناول ''بستی'' میں بھی امریکی بحری بیڑے اور چینی افواج کی طرف سے امداد کا تذکرہ ملتا ہے۔

''یہ خبر ہے یا افواہ ہے؟''

''صاحب! مصدقہ خبر ہے۔ ساتواں بحری بیڑا چل پڑا ہے۔''

''واقعی!''

''واقعی، اب تو خلیج بنگال میں داخل ہونے والا ہے۔ بس اب جنگ کا پانسہ پلٹنے والا ہے۔'' ۵۹؎

امریکی بحری بیڑے اور چینی فوجی امداد کی افواہیں نہ صرف حکومتی سطح پر سننے کو ملتی تھیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ افواہیں عام لوگوں میں گردش کرتی رہیں۔ انتظار حسین ۱۵ دسمبر کی روداد بیان کرتے ہوئے ایک رکشہ ڈرائیور کے ذریعے اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''رکشا اسٹارٹ کرتے ہی وہ شروع ہو گیا۔ ''باؤ جی جنگ کی کیہہ خبراں ہیں؟''

''کوئی نئی خبر نہیں۔''

''پھر میرے سے سنو چین دی فوجاں آ گئی ہیں۔''

''کون کہتا ہے؟''

''ایک باؤ میرے رکشے میں بیٹھا، اُس نے بتایا۔ پکی خبر ہے جی۔ رات کو جتنی لڑائی ہوتی ہے۔ چینی فوجاں کرتی ہیں۔'' ۶۰

مگر عملی طور پر آخر تک یہ ممکن نہ ہو سکا اور محض طفل تسلی بن کر رہ گیا اور طاقت کے توازن میں واضح فرق کے سبب، پاکستانی فوجیوں کے تمام تر جذبوں کے باوجود، آخر کار پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ شہادت کے جذبے سے سرشار فوجی جوانوں تک جب ہتھیار ڈالنے کا حکم پہنچا تو وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گئے۔ اس موقع پر ان فوجی جوانوں کے جذبات کو طارق اسماعیل ساگر نے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔

''میجر صاحب نے سیٹ پر جھکتے ہی میرے ساتھ ''ہتھیار ڈالنے'' کا پیغام سنا تھا۔

''نہیں'' وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ ریڈیو آپریٹر کی آنکھیں بھی خون اگل رہی تھیں۔ میرے سر نے دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ ''بوائے''؟ وہ خاموش میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

''نو سر'' میں نے سر کو جنبش دی۔ میجر صاحب نے پاؤں کی ٹھوکر ریڈیو کو ماری اور دشمن کی بالادستی کا نوحہ الاپتی صدا کو موت آ گئی۔'' ۶۱

اس صداقت میں کوئی شک نہیں کہ جس وقت ہتھیار ڈالنے کا حکم آیا تو پاکستانی فوج مشرقی پاکستان کے کئی محاذوں پر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ رہی تھی اور ان کے لیے یہ حکم ان کی توقعات کے خلاف تھا۔ جیون خان ایک ایسے ہی محاذ کا احوال بیان کرتے ہیں۔

''ماجد حیران تھا، کیا کرے، کیا سمجھے۔ وہ ہمت مجتمع کر کے بولا، ''سر! میجر صاحب نے واپسی کا حکم دیا تھا، آپ کی طرف سے انھیں کیا کہوں۔''

''کچھ نہیں، کچھ نہیں'' کرنل کی آواز درد میں ڈوب گئی۔ کچھ دیر وہ پھر سر کو تھامے بیٹھے رہے، پھر رومال سے آنکھیں صاف کیں اور لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پانی سر سے گزر چکا ہے، ہائی کمان نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' ماجد کا سر چکرانے لگا۔ کمرے میں ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے شدید ضرب لگائی ہے اور گرا چاہتا ہے۔ ''جاؤ بیٹے سب کو بتاؤ کہ لڑائی ختم ہو چکی ہے'' اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ لڑائی ختم ہو چکی ہے۔۔۔ کیسے، کہاں ۔۔۔ لڑ تو ہم رہے تھے ۔۔۔ محاذ جنگ تو سرحدوں پر تھا جہاں ہم انھیں گھیرے میں لیے تھے

تو پھر ہائی کمان نے ڈھاکہ میں کیوں ہتھیار ڈال دیے۔'' ۶۲؎

سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے پر یہ جذبات نہ صرف ان فوجی جوانوں کے تھے جو اس وطن کی سالمیت کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے بیٹھے تھے بلکہ سقوط کی خبر ہر محبِ وطن پاکستانی پر بجلی بن کر گری۔ انتظار حسین ''بستی'' میں ایک کردار کے ذریعے ایسے ہی محبِ وطن عناصر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار خواجہ صاحب پر، سقوط کی خبر سن کر جو بیتی، وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''مولانا صاحب! میں ریڈیو سن رہا تھا تو جی چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں مگر میں بوڑھا آدمی، جوان اولاد کے سامنے روتا کیا اچھا لگتا تھا؟ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ آخر اٹھ کے کمرے سے نکل گیا اور صحن میں درخت کے نیچے کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ سب کمرے میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ بس بند ٹوٹ گیا۔'' ۶۳؎

بعض ناول نگاروں نے ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا بھی تذکرہ کیا ہے اور سقوط ڈھاکہ کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات بھی مفصل انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس سے قاری نہ صرف پس منظر اور پیش منظر سے آگاہ ہو جاتا ہے بلکہ اس سانحے کے بطن سے پھوٹنے والے حالات بھی اس کے علم میں آ جاتے ہیں۔

> ''سقوطِ ڈھاکہ کی خبر آتے ہی فرید پور سنٹرل جیل کے پٹ کھول دیے گئے۔ قیدی ''بنگلہ دیش کی جے'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کی طرح باہر نکلے اور جدھر سے گزرے، کمزور، بے بس انسانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتے چلے گئے۔ جیل کی چار دیواری البتہ زیادہ دیر تک سونی نہ رہی۔ دوسرے ہی دن اور طرح کے لوگ داخل ہونا شروع ہو گئے، عجیب سے لوگ جو بھلے وقتوں میں قید خانے کے سائے تک سے دور رہتے تھے۔ وہ لوگ جن کا گناہ پاکستان کی حمایت تھا۔'' ۶۴؎

سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے سے یوں تو پاکستان کا ہر شہری، خواہ اس کا تعلق مشرقی حصے سے تھا یا مغربی حصے سے، خواہ وہ علاحدگی پسند تھا یا ملکی سالمیت کا حامی، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا مگر انسانی سطح پر اس المیے سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا طبقہ ''بہاریوں'' کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ۱۹۴۷ء میں اپنا سب کچھ لٹوا کر امن اور سکون کی تلاش میں مشرقی پاکستان میں آ بسے مگر محض پچیس سال کے بعد انھیں ایک بار پھر اسی تجربے سے گزرنا پڑا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس بار ان کے جسموں اور دل و دماغ پر گزرنے والا یہ سانحہ پہلے سے کہیں بدتر تھا ہجرت در ہجرت کے ان المناک سانحات سے گزر کر قرۃ العین کے ناول ''چاندنی بیگم'' کا ایک کردار شیخ طاہر علی فیل فروش یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتا ہے ''ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں اپنے آبائی گاؤں سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔'' ۶۵؎ اس عرصے میں انھیں ان حالات سے

گزرنا پڑتا ہے کہ پچیس سال کے عذاب سہنے کے بعد انھیں دنیا کا کوئی خطہ پناہ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔'' ڈاکٹر خالد اشرف کے بقول:

''۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ کے سقوط کے بعد مکتی باہنی کے والنٹیر وں نے اور دوسرے قوم پرست بنگالی عناصر نے پاکستانی فوج کے مشرقی پاکستان میں کیے گئے گھناؤنے جرائم کا انتقام ان مہاجرین سے لیا جو''بہاری'' کہلاتے تھے۔ان بدنصیبوں کو کوئی ملک اپنانے کے لیے تیار نہ تھا اور ہر جگہ ان کے لیے جیلوں اور اذیت خانوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔''۶۶

سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ جہاں قومی حوالے سے ایک بہت بڑا سانحہ بن کر سامنے آیا، وہاں اس المیے نے فرد کی ذاتی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ان متاثرین میں صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کا المیہ سرفہرست ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں آکر آباد ہوئے مگر بد قسمتی سے بنگالیوں کے ساتھ گھل مل نہ سکے اور عرصے تک ان کا علاحدہ تشخص برقرار رہا۔''اللہ میگھ دے'' کے دو کردار اس مسئلے پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔

''یار بہاریوں کو یہاں آباد ہوئے لگ بھگ بیس برس سے زاید عرصہ گزر چکا ہے اور آج بھی محمد پور اور میر پور جیسے جزیروں میں رہ رہے ہیں۔'' فضلو نے تنک کر کہا۔

''فضلو! محمد پور اور میر پور ممکن ہے ہم میں سے کئی چیٹی مائنڈڈ بنگالیوں کی سوچ کا منطقی نتیجہ ہو۔''

قیوم بولا

''یار تم پھر فلسفہ بگھارنے لگتے ہو۔بیس اکیس برس کا عرصہ کیا کم ہوتا ہے۔'' فضلو ہار ماننے والا کہاں تھا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں Cultural Assimilation اتنی آسان بات نہیں ہے اور پھر اردو اسپیکنگ آبادی کا ایک مضبوط ثقافتی پس منظر بھی ہے۔انھیں یہاں کی ثقافت سے مربوط ہوتے ایک وقت درکار ہے۔یہ سب کچھ تو ایک تدریجی عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔''۶۷

ناول نگار نے بہاریوں کے المیے کا جائزہ لیتے ہوئے انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کا بھی خوب صورت اظہار کیا ہے کہ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور اپنی عمر کا اوائل حصہ گزارتا ہے اسے کبھی نہیں بھولتا،ایک بہاری نوجوان عمر اپنے گھر بار کو یاد کرتا ہے۔

''اپنی کہانی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' فردوسی نے لمبا سانس لیا۔

''کیسی کہانی''؟

''پٹنہ سے محمد پور کی کہانی''

''کیا کہنا چاہتے ہو''

''آج مجھے بڑی شدت سے گھر یاد آ رہا ہے۔''۶۸؎

بہاریوں نے پاکستان کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا تھا چنانچہ علاحدگی کی اس تحریک میں انھوں نے پاکستان کی سالمیت کی حمایت کی جس کے نتیجے میں انھیں بنگالیوں نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔''مزمل نے ظہر کی نماز دکان ہی پر شروع کر دی تھی ۔ مسجد میں بڑی سیاست ہوتی ۔ بی ہری لوگ کے ساتھ صف بستہ ہو نا زمین کے بیٹے اب اچھا نہیں سمجھتے تھے۔''۶۹؎ آہستہ آہستہ بڑھتی یہ ناپسندیدگی کی فضا بداعتمادی میں بدل گئی اور بہاری اور بنگالی دو الگ الگ قومیں بن کر رہ گئیں۔

''عجیب حادثہ ہے، وہ مجنونانہ انداز میں ہنسا، وہاں سن آف دی فیتھ (Son of the faith) نہ تھا اور یہاں سن آف دی سائل (Son of the soil) نہیں ہوں۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔''۷۰؎

''چلتا مسافر'' میں الطاف فاطمہ نے بھی بہاریوں کے اس مسئلے کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ تسنیم آصف کے بقول ''الطاف فاطمہ نے ''چلتا مسافر'' میں ہجرت کے تجربے سے گزرنے اور مہاجر کے دل میں پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے ہجرت کی تکالیف اور نتائج کو حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔''۷۱؎ اس ناول کا مرکزی موضوع ہی انھی لوگوں کا المیہ ہے۔ یہ ناول ان کے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے حالات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

''الطاف فاطمہ کے نئے ناول ''چلتا مسافر'' میں بہاری مسلمانوں کی جدوجہد اور آزادی کے لیے قربانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ان ہجرتوں کی داستان ہے جس کے پس پشت خلوص، قربانی اور ایثار کا وافر جذبہ موجود ہوتا ہے۔''۷۲؎

بہاریوں کے مسئلے پر لکھا گیا یہ واحد مکمل ناول ہے جس میں ناول نگار نے اس مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے ایک ایسے گھرانے کا انتخاب کیا ہے جو ۱۹۴۷ء میں بھارت سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو جاتا ہے مگر تھوڑے ہی عرصے میں حالات ایسا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے ایک بار پھر ہجرت کے اسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

''ہر لمحہ آتا اور جاتا مجھے صدا دے رہا ہے۔''اٹھ کہ وقت سفر آیا، وقت سفر، سفر، زادراہ اور الوداع! گھنشیام کے گھر کو بھی الوداع! گھنشیام کے اس گھر سے میرا کیا تعلق بنتا ہے؟ مزمل کو اب دماغ پر زور ڈالنا بھی شاق تھا، پر ایک پھانس تھی کہ دل میں گڑی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھا اور سوال کیا۔ اس شہر کو اور اس شہر کے لوگوں کو میں کب جانتا تھا؟ مجھے یہاں کس نے

پہچانا؟اور میں نے یہاں آکر کسی سے کچھ مانگا؟ مانگتا بھی تو کیا؟ جس کی جھولی خالی ہو، وہ مانگے۔ میری جھولی میں میرا خواب تھا، میری محنتیں تھیں، میرے گھر کی شہادت تھی۔''۳ے

ناول کا ایک مرکزی کردار مدثر فسادات کے دوران جب گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو اس انداز میں سوچتا نظر آتا ہے۔

''آج میرا باپ دوسری اور میں پہلی مرتبہ اپنا گھر بار چھوڑ رہے ہیں۔ کیا تمام دنیا میں ایسے انقلابات آتے ہیں کہ لوگ آئے دن بے گھر ہوتے ہیں یا صرف یہ ہمارا ہی مقدر ہے۔''۴ے

الطاف فاطمہ نے اس ناول میں جہاں بہاریوں کے المیے کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے وہاں مغربی پاکستانی حکمرانوں کی بے حسی کی ایک جھلک بھی پیش کردی ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے سانحے نے عام محب وطن پاکستانی کو تو گہرے دکھ میں مبتلا کر دیا مگر دکھ اور افسوس کے ان لمحوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہ تھی جن پر اس سانحے نے کوئی اثر نہ ڈالا۔ یہ بے حس پاکستانی اس المیے سے بے نیاز اپنے معمولات میں مصروف رہے۔ توصیف احمد نے اپنے مضمون ''مجھے کیا کیا یاد آیا'' میں ان لوگوں کی ایک جھلک پیش کی ہے۔

''سامنے محل نما کوٹھی کا گیٹ کھلا اور ایک گہرے فیروزی رنگ کی امپالا ایک جوڑے کو آغوش میں سمیٹے رعونت سے باہر نکلی۔ مرد نے کالے رنگ کا بھاری سوٹ پہن رکھا ہے۔ عورت نے نارنجی رنگ کی ہلکی سی ساڑھی زیب تن کی ہوئی ہے۔ ہونٹوں پر اسی رنگ کی لپ اسٹک اور لہراتی زلفوں میں اسی رنگ کے پھول سجانا بھی وہ نہیں بھولی تھی۔۔۔ شام غریباں اور یہ سنگھار!......یہ لوگ اسی میں خوش ہیں کہ جنگ ختم ہوگئی ہے اور ان کی راتیں پھر سے چمک اٹھی ہیں۔''۵ے

ناول کا ایک کردار مدثر جب مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد مغربی پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد پہنچ جاتا ہے تو یہاں کے حالات دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وہ ایک خط میں یہاں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''اسلام آباد واقعی روشنیوں کا شہر ہے۔ بڑے رونق میلے ہیں یہاں۔۔۔ ابو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس قوم کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ کس کا بازو کٹ گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر لگتا ہے کہ ہم جس تجربے اور واردات سے گزرے تھے وہ سب ایک وہم اور خیال تھا۔۔۔ یہاں میلے لگ رہے ہیں، باراتیں چڑھ رہی ہیں۔ اب تو نوے ہزار قیدیوں کا غم بھی عام نہیں رہا۔ تقریروں اور قیدیوں کے کنبوں میں یہ چرچا سننے میں آتا ہے۔''۶ے

''چلتا مسافر'' ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جس کے مقدر میں بس چلنا ہی لکھا ہے، منزل نہیں۔ یہ سفر نصیب ۱۹۴۷ء سے سفر میں ہے مگر آج تک اسے منزل نہیں ملی۔ وہ نہ ہندوستانی رہا، نہ بنگالی اور نہ پاکستانی، وہ تو فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ الطاف فاطمہ نے فضا میں معلق اس فرد کی کہانی مؤثر انداز میں بیان کی ہے جس سے سانحہ مشرقی پاکستان کے بطن سے جنم لینے والے ایک اہم انسانی المیے پر روشنی پڑتی ہے۔ ''بہاریوں کے مسئلہ پر اب تک کسی نے بھرپور طریقہ پر قلم نہ اٹھایا تھا۔ ہمیں الطاف فاطمہ کا مشکور ہونا چاہیے کہ جنھوں نے ''چلتا مسافر'' لکھ کر یہ فرض کفایہ ادا کیا ہے۔''۷۷

عام طور پر ادیب زندگی کے کسی واقعے سے متاثر ہو کر قلم اٹھاتا ہے مگر اس کا قلم اس واقعے کے بیان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اس واقعے کے آئینے میں انسان اور انسانی فطرت کے لاتعداد پہلوؤں کو نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ تخلیقی ادب پارے کے ذریعے زندگی کی یک رخی تصویر ہی پیش نہیں کرتا بلکہ اس واقعے کے پس منظر میں کارفرما انسانی باطن کی بے شمار پرتیں کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔ لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔''۷۸

اسی طرح ظفر پیامی اپنے ناول ''فرار'' کے ذریعے بھی قاری تک یہی پیغام پہنچاتے نظر آتے ہیں کہ جغرافیائی تقسیم، خواہ وہ ۱۹۴۷ء کی ہو یا ۱۹۷۱ء کی، اس کے نتیجے میں انسانوں نے بے پناہ مظالم برداشت کیے۔ ڈاکٹر خالد اشرف کے بقول ''ناول ''فرار'' جہاں ہر طرح کی لادی ہوئی ہجرت کے خلاف ہے وہیں اس کا تھیم جنگ کے خلاف بھی ہے کیونکہ جنگ کی وجہ سے بنگلہ دیش کی عظیم انسانی ٹریجڈی رونما ہوئی تھی۔''۷۹

مشرقی پاکستان اپنے آخری دنوں میں شدید فسادات کی زد میں آ گیا۔ فسادات کے ان دنوں میں انسانی فطرت کھل کر سامنے آ گئی۔ ہمارے ناول نگاروں نے فسادات کے ان دنوں کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا اور ان حالات میں وہاں ہونے والی انسانی فطرت کے ان مظاہر کو بھی ناولوں کا حصہ بنایا جو عام حالات میں سامنے نہیں آتے۔ یہ وہ دن تھے جب انسان تہذیب کے تمام تر لبادے اتار کر سامنے آیا۔ ناول ''فرار'' کے مصنف ظفر پیامی انسانی نفسیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ انور سدید کے بقول:

> ''اس ناول میں ان کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے اس خطے میں سب انسانوں کی سوچ ایک جیسی اور اصل ایک جیسا ہے۔ ہر شخص اپنے باطن کا مجرم ہے اور حقیقت سے فرار اختیار کر رہا ہے۔ چنانچہ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس خطے کے انسان تبدیل نہیں ہوتے، ضرورتیں تبدیل نہیں ہوتیں، صرف چہرے تبدیل کر لیے جاتے ہیں۔''۸۰

جیون خان نے انسان کی ان کیفیات کا بطورِ خاص مطالعہ کیا اور ''دپتی'' میں مختلف کرداروں کی صورت میں پیش کیا۔انھوں نے انسان کے باطن میں چھپی اس حیوانیت کا عکس پیش کیا ہے جو عام حالات میں تہذیب کے پردے میں چھپی رہتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار دپتی فسادات کے موقع پر مختلف حادثات سے گزرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر انسانی روپ میں درندوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ سوچتی ہے۔ ''خدا انسانوں کے روپ میں درندے کیوں پیدا کرتا ہے؟''[۸۱] بہ ظاہر آزادی کی خاطر لڑنے والے اور اپنی جان قربان کرنے والے اپنے نفس سے شکست کھا جاتے ہیں اور وطن کو آزاد کرانے کی دھن میں مصروف نوجوانوں کو جب اپنی ہوس پوری کرنے کا موقع ملتا تو وہ سب کچھ بھول جاتے۔

> ''قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، جو ہاتھ جہاں پڑا، پڑ گیا، نہ دیکھا کہ مرنے والا معصوم بچہ تھا یا کوئی کمزور عورت ۔اس ہذیانی کیفیت میں بھی نفسانی ہوس کا جنون بدرجہ اتم قائم رہا۔ہجوم میں سے جس کسی کے ہتھے کوئی جوان لڑکی چڑھی وہ لے اڑا۔نہ اسے آزادی کی دیوی کی حنا بندی یاد رہی نہ بیماریوں سے شدید نفرت۔''[۸۲]

اسی طرح ایک اور موقع پر جیون خان آزادی کے لیے لڑنے والوں کا احوال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''وقت کا چیختا چنگھاڑتا رتھ دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہر لمحے جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ عصمتیں لٹ رہی تھیں۔رات کی تاریکی میں مکتی باہنی کے کچھ نوجوانوں کے ہاتھ گھروں میں سوئی ہوئی بنگالی لڑکیوں کے گریبانوں تک جا پہنچے۔۔۔۔۔۔ دیکھا کہ بھائیوں کے جسموں کی حدت بہنوں کو جھلس رہی ہے۔''[۸۳]

ناول کا ایک کردار ماجد جس نے ہمیشہ اخلاق کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھا اور سچ کا ساتھ دیا مگر اُسے اکثر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان ہنگاموں اور قتل و غارت سے تنگ آ کر وہ انسان کے بارے میں اس طرح سوچتا ہے۔

> ''خالقِ کون و مکاں بھی تو انسان کو انسان کا گلا کاٹنے سے باز نہیں رکھ سکتا، حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان اس کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ بھلا کون خالق اپنی مخلوق کو تباہ ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ یہ خدا بھی عجیب معمہ ہے۔اخلاق، تہذیب، انسانیت سب جھوٹ ہے۔ اولادِ آدم خونخوار جانوروں کی ایک قسم ہے۔''[۸۴]

ناول کا ایک اور کردار مدن بھی اسی قسم کے حالات سے گزر کر کہتا ہے۔ ''یہ قومیتیں، یہ سرحدیں، یہ گروہ بندیاں بے معنی ہیں۔لکیر صرف ایک ہے جو انسان کو غیر انسان سے جدا کرتی ہے۔''[۸۵] جیون خان کا یہ ناول رنگ، نسل، علاقائیت اور مذہب سے بلند تر ہو کر انسانیت کا درس دیتا ہے۔ناول نگار نے اس ناول میں ہندو اور مسلمان کردار اس طرح پیش کیے ہیں کہ دونوں مذاہب کے حامل لوگوں میں بحیثیت انسان اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ جیون خان کے بقول ''انھوں

نے انسان کے اندر چھپی اچھائیوں اور برائیوں کو موضوع بنایا ہے اور یہ انسان ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔"[۸۶] محبوب خان نے "دیپتی" میں انسان کے کئی ایسے پہلو بیان کر دیے ہیں جو کم کم ہی سامنے آتے ہیں۔

اردو ناول کا ایک اپنا خاص مزاج ہے جس کے تحت تاریخی نوعیت کے ناولوں میں بھی ناول نگار محض تاریخ کی گتھیاں سلجھانے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے دائیں بائیں موجود زندگی کی کئی ایک جھلکیاں بھی پیش کر دیتا ہے۔ جس کے ذریعے ناول، اپنے تاریخی مقام و مرتبے کے ساتھ ساتھ تخلیق کے ساتھ بھی اپنا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ناول کی انہی فنی خوبیوں میں سے ایک خوبی گردوپیش موجود زندگی اور ماحول کی عکاسی بھی ہے۔ سہیل بخاری ناول میں منظر نگاری کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "کامیاب منظر نگاری سے بھی افسانے (ناول) میں جان پڑتی ہے۔ باغ و راغ، کوہ و دشت، میلوں ٹھیلوں، براتوں جلوسوں، صبح و شام اور رزم و بزم کے نقشے، شادی بیاہ کی تصویریں اور موسموں کے مرقع سب اسی تحت میں آتے ہیں۔ یہاں کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ جو منظر پیش کیا جائے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔"[۸۷]

چنانچہ ہمیں سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں میں بھی مشرقی پاکستان کے موسموں اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کی خوب صورت جھلکیاں جا بجا نظر آ جاتی ہیں۔ سلمیٰ اعوان، جن کا کہنا ہے کہ "انھوں نے مشرقی پاکستان جا کر وہاں کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی اور حالات کا تفصیلی جائزہ لیا اور اپنے مشاہدات کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔"[۸۸] سلمیٰ اعوان نے بنگالی معاشرے کے رسم و رواج کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ایک منگنی کی تقریب کا احوال اس طرح بیان کیا ہے۔

> "لڑکے والے آج لڑکی کو دیکھنے آ رہے تھے۔ چار بجے وہ لوگ آئے۔ ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔۔۔ اور پھر یوں ہوا بیش قیمت روپہلی ساڑی میں ملبوس میک اپ سے سجی سجائی لڑکی کا گھونگٹ نکال کر اسے اس کمرے میں لایا گیا جہاں وہ سب تھے۔ وہ نصف دائرے کی ترتیب میں بیٹھے ہوئے تھے اور لڑکا قدرے اگلی طرف کو نکلا ہوا تھا۔ تب لڑکی کا گھونگٹ الٹا گیا اور سب نے اسے بغور دیکھنا شروع کیا، اس کے بال دیکھے گئے، ہاتھ پاؤں کا جائزہ لیا گیا۔"[۸۹]

الطاف فاطمہ نے بھی بنگال کے معاشرے کے اسلامی پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً جب مزمل گھنشیام کا گھر چھوڑ کر کیمپ کی طرف آتا ہے اور سارا سامان اٹھا لینے کے بعد اماں بیگم سے کہتا ہے کہ آؤ چلیں تو اماں بیگم کہتی ہیں "جاءنماز لے لوں، حمائل شریف تو میں نے لے لی ہے۔"[۹۰] "اللہ میگھ دے" میں مختلف موقعوں پر بنگال کی معاشرت اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

''چائے کے باغات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دور دور تک چائے کے جھرمٹ دیکھ کر مجھے آسودگی اور ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ سبز جھرمٹوں میں، رنگ برنگی سوتی لنگیوں میں ملبوس گٹھے جسم والی عورتیں پتیاں چنتے بڑی دل کش دکھائی دیتیں۔'' ۹۱

ناول نگاروں نے معاشرتی زندگی کی تصویروں کے ساتھ ساتھ بنگال کے قدرتی حسن کے نمونے بھی اپنی تحریروں میں بیان کر دیے ہیں۔ جیون خان ''دیپتی'' میں شام کے منظر کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں پانی پر تیر رہی تھیں۔ ندی کے دونوں طرف سرسبز کھیت تاحدِ نظر پھیلے تھے۔ درخت جھوم رہے تھے۔ گھونسلوں کو لوٹنے والے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور دور کہیں ایک ماجھی گیت گا رہا ہے۔'' ۹۲

اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں بھی جا بجا فطرت کے مناظر کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے جس سے نہ صرف مشرقی پاکستان کے علاقوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے بلکہ کرداروں اور ماحول کے درمیان ہم آہنگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

''سیلاب اتر گیا۔ درخت سطحِ آب پر نمودار ہوئے۔ ٹیلوں پر بنے جھونپڑے، ننھے منے زمردیں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں، ریت کی لہروں پر راج ہنس کے پنجوں کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بھیگی دھرتی پر نئی فصلیں بوئی جا رہی ہیں۔'' ۹۳

تاریخ کے کسی بھی دور کو کہانی کی صورت میں پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والا اس دور سے نہ صرف جذباتی وابستگی رکھتا ہو بلکہ اس کے پاس اس دور کے بارے میں تمام تر خارجی معلومات بھی ہوں۔ وہ اس زمان و مکاں کی جزئیات سے اچھی طرح آگاہ ہو تب ہی وہ کہانی میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے گا جو قاری کو موجودہ عہد سے نکال کر مخصوص عہد میں لے جا سکے۔ مخصوص عہد اور مقام سے جذباتی وابستگی اور تمام تر معلومات کی موجودگی میں وہ اعلیٰ پائے کا تخلیقی ناول لکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ سید وقار عظیم کے بقول:

''اس سفر کی منزلِ آخر یا منزلِ مقصود وہ فنی تخلیق ہے جو ایک تاریخی کہانی یا تاریخی ناول کی شکل اختیار کر کے پڑھنے والوں کو ان کے عہد سے دور کے کسی عہد میں لے جا کر ان کے گرد و پیش ایسا منظر پیش کرتی ہے جو زمان و مکاں کے بُعد کے باوجود انھیں اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔'' ۹۴

سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھنے والے ادیب اس شرط پر اس لیے بھی پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر نے مشرقی پاکستان کے ان دنوں کا خود مشاہدہ کیا۔ انھوں اس سانحے کو داخل اور خارج کی سطحوں پر دیکھا، سمجھا اور اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے ہمہ پہلو سانحے کے بیان کے لیے ناول کی صنف نہایت

موزوں تھی کیونکہ ناول اپنی طوالت اور دیگر فنی خوبیوں کی بنا پر زندگی کا مطالعہ زیادہ گہرائی کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہے۔
ڈاکٹر احسن فاروقی ناول کی اس خاصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ناول جدید دور کی سب سے اہم صنف ہے اور اس کے ذریعے آج فطرت کا وہ فرض انجام پاتا ہے جس کے لیے ازل سے ادب وجود میں آیا۔ ادب انسانی جذبات کی گہرائیوں کا تجربہ پیش کرتا آیا ہے۔ محبت، عقیدت، حبِ وطن، حبِ جاہ، ایک مکمل زندگی کا خواب وغیرہ کے عینی حالات کو وہ الفاظ کے ذریعے عجیب عجیب شکلیں دیتا رہا۔ وہ حقائق یا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ہی ابھرا مگر اس دنیا میں پہنچا جہاں یہ حقیقتیں نکھر کر، سدھر کر اور رنگ بدل کر خوبصورت تر، عظیم تر، دردناک تر، مضحکہ خیز تر دکھائی دیں۔''۹۵

کسی بھی ناول کے واقعات، ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے ارتقائی مراحل طے کرتے ہیں۔
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ناول میں کرداروں کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ناول میں زندگی کا اظہار زیادہ تر کردار نگاری کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ناول کے کردار کو زندگی کے مطابق ہونا چاہیے کیوں کہ یہ جس حد تک زندگی کے مطابق ہوں گے اتنے ہی زیادہ دلچسپ ہوں گے۔''۹۶

سہیل بخاری کے بقول ''جس ناول کے کردار زندگی کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں، وہی کامیاب رہتا ہے''۹۷ ناول کے یہ کردار اسی صورت میں جیتے جاگتے تصور کیے جائیں گے جب وہ جامد نہ ہوں بلکہ عام انسانی فطرت کے مطابق ارتقا پذیر ہوں۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے ناولوں کے کرداروں کا مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول چونکہ ایک ایسے زمانی پس منظر میں لکھے گئے ہیں جس میں انسان کے بہت سے پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ انسان کے باطن میں چھپی اچھائیں اور برائیاں اس طور ابھر کر سامنے آئیں کہ وہ کہیں تو فرشتے کی صورت میں نظر آیا اور کہیں شیطان بن کر سامنے آیا۔ ہمارے ناول نگاروں نے انسانی باطن کی یہ تصویریں مختلف کرداروں کی صورت میں بہت خوب صورت انداز میں پیش کی ہیں۔ ناول ''دہلیز'' کا ماجد ایک ایسا کردار ہے جس نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا اور اخلاق و تہذیب اور انسانیت کا علمبردار رہا مگر اس کے بدلے میں ہمیشہ تکالیف اٹھائیں۔ وہ جب ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں میں انسانوں کو درندوں کے مقام سے بھی گرتے دیکھتا ہے تو تہذیب اور انسانیت کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے اولادِ آدم کو خونخوار جانوروں کی قسم خیال کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح اس ناول کا ایک کردار مدن بھی حالات دیکھ کر مذہب کی گروہ بندیوں سے انکار کر کے محض انسانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ''چلتا مسافر'' کے کردار مزمل، ''فرار'' کے تاری اور ''اللہ میگھ دے'' کے فردوسی کی صورت میں

ہجرت در ہجرت کے المیے کے شکار بہاریوں کے المیے کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ وہ بدنصیب کردار ہیں جنھیں زمین کا کوئی ٹکڑا اپنانے کو تیار نظر نہیں آتا۔ ناول ''فرار'' کا ایک ایسا کردار تاری ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف اس کردار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''تاری اپنے دوستوں کی مدد سے، جن میں پنجابی، بنگالی، ہندو اور مسلمان سبھی شامل ہیں۔ مکتی باہنی کے چھاپہ ماروں سے بمشکل اپنی جان بچاتا ہوا لکھنؤ پہنچ جاتا ہے کیونکہ یہ شہر ڈھاکہ، دہلی یا کراچی کی بہ نسبت محفوظ تھا لیکن تاری یہاں بھی غیر ملکی ہے۔ شہریت اور وطنیت کا مسئلہ اس کے سامنے بدستور موجود ہے۔'' ۹۸

''اللہ میگھ دے'' کا کردار فردوسی جب زمین کے بیٹوں کے لیے ناقابلِ اعتماد بن جاتا ہے تو وہ اسی عذاب میں مبتلا نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر قابلِ اعتبار نہیں تھا اور اہلِ بنگال اسے Son of the Soil ماننے کو تیار نہیں۔ وہ اس مقام پر آن کھڑا ہوتا ہے کہ نہ ماضی کی طرف پلٹ سکتا ہے اور نہ حال اُسے قبول کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ ''چلتا مسافر'' کا مزمل زمین کے بیٹوں کے ساتھ گھلنے کی پوری کوشش کرتا ہے مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور پھر ایک دن دوسری بار اپنا گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے اس کردار کے ذریعے بہاریوں کے المناک انجام کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔

ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں مختلف کرداروں کے ذریعے ان علاحدگی پسند عناصر اور ان کے علاحدگی پسند اندازِ فکر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ناول نگاروں نے ان کرداروں کے ذریعے جہاں علاحدگی پسندوں کی سوچ کے پس منظر میں کارفرما بنگالی ہندوؤں اور بھارتی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے وہاں مغربی پاکستانی حکمرانوں کے طرزِ حکمرانی کے سبب بنگالیوں میں پیدا ہونے والی محرومیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ''تنہا'' کا فخر جب متحدہ پاکستان کے بائیس سالوں کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے اقتصادی بدحالی، سیاسی حق سے محرومی اور فوجی آمریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اجتبیٰ الرحمٰن اس حیرت میں مبتلا نظر آتا ہے کہ اتنے احتجاج کے باوجود مغربی پاکستانی حکمران زبان کے مسئلے پر بنگالیوں کے احساسات کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں۔ ''اللہ میگھ دے'' کا روح القدس ان طالب علم راہنماؤں کی ترجمانی کرتا ہے جنھوں نے اس تحریک میں ہراول دستے کا کام سرانجام دیا۔ اس ناول کے ایک کردار ابوالقاسم کو حکمرانوں سے اس بات کا گلہ ہے کہ اقتصادی حوالے سے سارا زور مغربی پاکستان پر لگایا جا رہا ہے۔ اسی ناول کا ایک اور کردار فضلو قومی زبان کے مسئلے پر مغربی پاکستان سے ناراض نظر آتا ہے۔ ''صدیوں کی زنجیر'' کا میلو بے گناہ نہتے شہری کو پاکستانی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھ کر مکتی باہنی میں جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ ''دہلیز'' کے کردار مدن کے ذریعے جیون خان بھارت کی ان خفیہ بھارت کی ان خفیہ سرگرمیوں سے پردہ اٹھاتے ہیں جو اس نے پاکستان کو توڑنے کے لیے سرانجام دیں۔

ناول نگاروں نے جہاں مختلف کرداروں کے ذریعے ملک دشمن عناصر کی نمایندگی کی ہے وہیں انھوں نے ایسے محبِ وطن عناصر کا بھی تذکرہ کیا ہے جو آخری وقت تک وطن کی سالمیت کے لیے جدو جہد میں مصروف رہے۔ اس ضمن میں طارق اسماعیل ساگر کے تینوں ناولوں کے فوجی کردار اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے مشرقی پاکستان میں نامساعد حالات کے باوجود شجاعت اور بہادری کے وہ کارنامے رقم کیے کہ جن کا اعتراف دشمن نے بھی کیا۔ ''دیپتی'' کا کردار ماجد اس وقت چکرا کر رہ جاتا ہے جب اسے ہتھیار گرانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہوتا ہے کہ لڑتو وہ محاذِ جنگ پر رہے تھے تو پھر ہائی کمان نے ڈھاکہ میں ہتھیار کیوں ڈال دیے۔ سلمٰی اعوان نے ''تنہا'' میں ایسے کردار متعارف کروائے ہیں جو پاکستان کی سالمیت کو اپنے وجود کی طرح خیال کرتے ہیں۔ سمیعہ علی اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو غیر جانبداری سے حالات کا جائزہ لیتا ہے اور بنگالیوں کے علاحدگی پسند خیالات کو مغربی پاکستانی افسران کے رویوں کا ردِعمل خیال کرتا ہے۔ ''آپ لوگوں نے بھی انھیں نکمے، نااہل، سست اور سازشی کہہ کر ان سے نہایت توہین آمیز برتاؤ کیا ہے اور ان کے رویے میں خود اس سلوک کے ردِعمل کو دخل ہے۔''[۹۹] سلمٰی اعوان کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستانیوں میں ''بہت سے لوگ تو اتنے وسیع الدماغ تھے کہ تعصب کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ مغربی پاکستان کے لوگوں کے بارے میں بہت اچھے خیالات رکھتے تھے۔''[۱۰۰]

مشرقی پاکستان کے اس پس منظر میں لکھے گئے یہ ناول تاریخی واقعات بیان کرنے اور سانحۂ مشرقی پاکستان کے اسباب وعلل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ، ناول ہونے کے ناطے، کرداروں کے باہمی قلبی رشتوں اور ان کے جذبوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ سلمٰی اعوان کے ناول ''تنہا'' کے دو کردار اجتبیٰ الرحمان اور سمیعہ علی مختلف نظریات اور مختلف خطوں سے تعلق کے باوجود دل کے رشتوں میں بندھے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے جذبات کو اپنے نظریات پر قربان کر دیتے ہیں۔ سمیعہ علی اجتبیٰ الرحمٰن سے اس شرط پر شادی کے لیے تیار ہوتی ہے کہ وہ علاحدگی پسند سرگرمیاں ترک کر دے مگر اجتبیٰ الرحمٰن اُس کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیتا ہے مگر اس کے باوجود سمیعہ علی کے ڈھاکہ چھوڑنے پر اسے پورا شہر ہی اجڑا اجڑا محسوس ہوتا ہے۔ ''ایک طویل عرصے بعد اس نے اپنی ماں کے شانے پر سر رکھا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جب اس نے کہا تھا ''ماں دیکھو تو ذرا باہر، ڈھاکہ تو اجڑا اجڑا لگتا ہے۔''[۱۰۱] بشیر احمد کے بقول ''یہ دونوں کردار نظریات کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی گہری محبت میں مبتلا ہیں۔''[۱۰۲] ناول ''دیپتی'' کے دو مرکزی کردار دیپتی اور علی اعظم مذہب کی تفریق کے باوجود محبت کے رشتوں میں پروئے ہوئے ہیں۔ دیپتی ہنگاموں کے دوران علی اعظم کو گھر میں چھپا لیتی ہے اور اس دوران اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنا مذہب بھی ترک کر کے مسلمان ہو جاتی ہے۔ وقت کا دھارا اُسے علی اعظم سے دور کر دیتا ہے مگر اس کے دل سے محبت کے یہ جذبات ماند نہیں ہوتے حتیٰ کہ وہ عشقِ مجازی کے راستے سے عشقِ حقیقی کی منازل طے کر لیتی ہے۔

''میں مسلمان ہوں'' وہ چونکی۔ ''کیا مسلمان ہونے کا مطلب صرف علی اعظم کو یاد کرنا ہے اور بس'' پشیمانی کا احساس بڑھنے لگا۔ ''علی اعظم خدا تو نہیں ہے پگلی'' جیسے علی اعظم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو واقعی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ خدا میری خطا معاف فرما'' کپڑے پہن کر وضو کیا۔ قبلہ رُو کھڑے ہو کر خدا کے حضور پیش ہوئی۔۔۔ رشتہ جڑنے لگا، خالق اور مخلوق کا۔ جسم فنا ہونے لگا۔ روح ابھرنے لگی۔''[۱۰۳]

''بستی'' میں ذاکر اور صابرہ کے دو کردار بھی اس رشتے میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ذاکر تو ہجرت کر کے پاکستان آ جاتا ہے مگر صابرہ ہندوستان میں ہی رہ جاتی ہے اور یوں ذاکر اور صابرہ کی دوری، قیامِ پاکستان کے بعد جدا ہونے والوں کی علامت بن جاتی ہے۔ سراج منیر کے بقول: ''صابرہ ناتمام محبت یا ازلی ہجر کی علامت ہے۔ لہٰذا وہ اور روپ نگر ایک جگہ پر آ کر ایک ہو جاتے ہیں''[۱۰۴] ذاکر اور اس کے والدین یو پی کی ایک بستی روپ نگر سے ہجرت کر کے پاکستان آ جاتے ہیں مگر تمام عمر روپ نگر اور صابرہ کی یادوں میں گزار دیتے ہیں۔

''مجھے اپنے گمشدہ پیڑ یاد آ رہے تھے۔ گمشدہ پیڑ، گمشدہ پرندے، گمشدہ صورتیں۔ نیم کے موٹے ٹہنے میں پڑا ہوا جھولا، صابرہ، لمبے جُھونٹے، نیم کی نبولی پکی، ساون کب کب آوے گا، بوندوں سے بھیگے گال پر گری ہوئی گیلی لٹ۔''[۱۰۵]

قرۃ العین حیدر کا ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' کا مرکزی موضوع گو کہ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ نہیں تاہم تاریخی حالات و واقعات کروٹیں بدلتے سقوطِ ڈھاکہ کے المیے پر منتج ہوتے دکھائی دیے گئے ہیں۔ اس ناول میں ریحان الدین احمد اور دیپالی سرکار مرکزی کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی زندگی میں عشق اور نظریات کے دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کے بقول:

''کرداروں میں سب سے اہم ریحان الدین احمد اور دیپالی سرکار ہیں۔ ان دنوں کا قصہ بہت ہی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ ان کی زندگی میں سیاست اور محبت، انقلاب اور عشق کے دھارے بڑے حسین انداز میں ملے ہوئے ہیں۔''[۱۰۶]

نیلم فرزانہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' کے کردار ریحان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں ''ریحان ایک عاشق اور ریحان ایک تحریک کا رہنما، اس کی شخصیت کے یہ دو پہلو تضاد کے حامل نہیں بلکہ ایک دوسرے کا اثبات اور تتمہ ہیں''[۱۰۷] طارق اسماعیل ساگر کے کردار گو کہ ایک ایسے پس منظر کے حامل ہیں جس میں عشق و محبت کے مواقع کم ہی ملتے ہیں مگر ناول نگار اپنے کرداروں کو گھما پھرا کر ایسے مواقع مہیا کرتے ہیں جہاں وہ ان لطیف جذبات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ناول میں مرکزی کردار کے ساتھ کسی نہ کسی رومانوی کردار کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ تاہم

رشید احمد گوریجہ کے بقول ''طارق اسماعیل ساگر کے کردار عشق اور محبت کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے مقاصد سے غافل نہیں ہوتے۔ وہ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چار کرتے ہیں۔''[۸۰] طارق محمود کے ناول ''اللہ میگھ دے'' کے دو کردار عمر اور بیوٹی بھی ایسے حالات کا شکار ہیں کہ چاہنے کے باوجود وہ ایک نہیں ہو سکتے۔ بیوٹی عمر پر یہ الزام لگا کر اس سے دور ہو جاتی ہے کہ اسے محض اس کے جسم سے دلچسپی ہے اور وہ اسے اپنائے بغیر اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا ہے۔ ناول کے آخری حصے میں ناول نگار نے کمال مہارت سے ان دو کرداروں کو مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کی سوچوں پر منطبق کر کے انھیں دو خطوں کی علامت قرار دیا ہے۔ ناول کے آخری حصے میں عمر بیوٹی کو یاد کرتا نظر آتا ہے اور آخری ملاقات میں بیوٹی کا کہا ہوا جملہ You want to posses me without owning me. فضا میں چاروں طرف گونجتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناول نگار نے ایک ایسے ہجوم کا ذکر کیا ہے جو ہاتھوں میں الاؤ تھامے عمر کی طرف بڑھتا ہے اور اسے ہجوم سے You want to posses me without owning me کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس موقع پر ناول نگار کو بیوٹی اور بنگالیوں کے جذبات ایک سے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ''بیوٹی کا چہرہ اور ہجوم کا روپ آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کبھی ایک چہرا سامنے آتا کبھی دوسرا''[۹۰] جس طرح بیوٹی کو شکایت تھی کہ عمر اسے اپنائے بغیر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستانیوں کو گلہ تھا کہ مغربی پاکستانی، بنگالیوں کو ان کے حقوق دیے بغیر، ان کی دولت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے یہ ناول نہ صرف تاریخ کی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے ہیں بلکہ ناول نگاروں نے جیتی جاگتی زندگی کے مختلف کردار متعارف کر کے ناول کی بنیادی ضرورت کا بھی خیال رکھا ہے۔

اگر سانحۂ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے ان ناولوں کے ذریعے اس سانحے کے اکثر پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب وعلل، بحران کے دنوں کا جائزہ اور اس سانحے کے بطن سے جنم لینے والے حالات و واقعات بیان کر کے پاکستان کی تاریخ کے اس باب کو محفوظ کر کے زندگی اور ادب کے گہرے تعلق کا ثبوت دیا ہے۔ قاری ان ناولوں کے مطالعے کے ذریعے تاریخ کے ان لمحات میں خود کو شریک کر لیتا ہے جو اس کے سامنے نہیں گزرے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ادب کے ذریعے، جیسا کہ میں نے کہا ہے، ہم دوسروں کے تجربوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ادب کی سطح پر ہم اپنی ذات سے بلند ہو جاتے ہیں''[۱۱] ہمارے ادب کا یہ حصہ قاری کو تاریخ کے ان تجربات کے ایک ایک پہلو میں اس طرح شامل کر لیتا ہے کہ جیسے وہ خود ان تجربات کا حصہ ہو۔ ناول نگار قاری کو نہ صرف خارج کی سطح پر رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کرتا ہے بلکہ وہ اسے اس شکست وریخت میں شامل کر لیتا ہے جو اس دور کے انسان کے داخل میں برپا ہوئی۔ یوں سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے یہ ناول، ناول نگاری کے تقاضوں پر پورا اترتے نظر

آتے ہیں۔ سہیل بخاری کے مطابق ناول انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا عکاس بن کر سامنے آتا ہے۔

''ناول میں زندگیوں کے مرقع پیش کیے جاتے ہیں، حقیقی و واقعی۔ موضوع کے اعتبار سے اس کا میدانِ عمل بہت وسیع ہے، اتنا ہی وسیع، جتنی خود زندگی ۔۔۔۔۔۔ وہ نہ صرف ماضی و حال کی عکاسی کرتا ہے بلکہ مستقبل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ وہ صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ اس کے ماورا بھی بہت کچھ دیکھتا ہے۔ اس کا کام تشخیص مرض ہی نہیں تجویزِ مداوا بھی ہے۔ وہ انسان کی صرف انفرادی زندگی ہی کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اجتماعی زندگی کی بھی تصویر کھینچتا ہے۔''[۱۱]

ماضی اور حال کے ترجمان اور انسانی باطن کی گہرائیوں میں جھانکتے یہ ناول اپنے قاری کے سامنے زندگی اور سماج کے مختلف پہلو عیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ ان ناولوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی قومی اور ذاتی سطح پر ایک بڑا حادثہ تھا۔ کسی ملک کا دولخت ہو جانا معمولی بات نہیں۔ ادیب معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے اور وہی قومی حادثوں کی شدت محسوس کرتا ہے اور اپنے فن پاروں میں اس کی عکاسی کرتا ہے مگر ہمارے ناول نگاروں نے اس حادثے کی شدت کو خاطر خواہ طریقے سے محسوس نہیں کیا۔ ناول اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعے کسی ہمہ پہلو واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے چنانچہ سقوطِ ڈھاکہ جیسے پہلودار سانحے کو پوری گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے ناول کی صنف نہایت موزوں مقام رکھتی تھی مگر ہمارے ناول نگاروں نے اس سانحے کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''سقوطِ ڈھاکہ جتنا بڑا قومی حادثہ تھا اس پر اتنے بڑے ناول نہیں لکھے گئے۔''[۱۲] کل آٹھ ناول نگاروں میں سے تین خواتین ہیں۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے۔ مجموعی طور پر اردو ناول نگاروں میں خواتین کی تعداد نسبتاً کم ہے مگر سانحۂ مشرقی پاکستان کے المیے کو خواتین ناول نگاروں نے زیادہ شدت سے محسوس کیا۔ تین ناول نگاوں یعنی سلمیٰ اعوان، جیون خان اور طارق محمود نے مشرقی پاکستان کے پرآشوب دور کا خود مشاہدہ کیا اور اپنے جذبات و احساسات کو ناول کی صورت میں پیش کیا۔ طارق محمود اور جیون خان نے اس سے پہلے نہ اس کے بعد کوئی ناول لکھا، گویا ان کی ناول نگاری اس سانحے کی مرہونِ منت ہے۔ طارق اسماعیل ساگر نے اس موضوع پر تین ناول لکھ کر اس سانحے سے اپنی جذباتی وابستگی کا ثبوت دیا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کی تعداد کم ہے مگر یہ ناول سانحے کے پس منظر، منظر اور پیش منظر کو مؤثر انداز میں پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

حوالہ جات

۰۱۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ''ناول کے جدید انقلابی اوراق''، پشاور، مجلّہ ''خیابان''، شعبۂ اردو، جامعہ پشاور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰

۰۲۔ راشدہ قاضی، ''اردو ناول کی روایت اور سیاسی و سماجی تغیرات''، لاہور، ماہ نامہ ''ماہِ نو''، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۲

۰۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''پاکستان کا تخلیقی منظر نامہ''، لاہور، ماہ نامہ ''ماہِ نو''، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

۰۴۔ احسن فاروقی، ناول کیا ہے، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۴۶

۰۵۔ راقم کی طارق اسماعیل ساگر سے ایک ملاقات، بہ مقام لاہور، بہ تاریخ ۲۲ اگست ۲۰۰۷ء

۰۶۔ بشیر احمد، سقوطِ ڈھاکہ اور اردو ناول، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۱

۰۷۔ سراج منیر، ''بشارتوں کے درمیان''، انتظار حسین: ایک دبستان، مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶، ص ۳۷۳

۰۸۔ شہزاد منظر، ناول، تخلیقی ادب ۲، کراچی، عصری مطبوعات، ۱۹۸۰ء، ص ۵۲

۰۹۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۴

۱۰۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۸۳ء، ص ۶۳

۱۱۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، ملتان، کاروانِ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۱

۱۲۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۸۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۱، ۱۱۰

۱۵۔ بانو قدسیہ، غیر مطبوعہ مکتوب بنام سلمیٰ اعوان، ۱۳ جنوری ۱۹۸۹ء

۱۶۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۰۱

۱۷۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۰

۱۸۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۲۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۲۰۔ راقم کی مسعود مفتی کے ساتھ ایک ملاقات، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۰۶ء

۲۱۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰

۲۲۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱

۲۳۔ رؤف ظفر، ماتمِ شہرِ آرزو، لاہور، کلاسیک، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۷

۲۴۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱، ص ۱۷۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۲۶۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۳۹

۲۷۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۴۸

۲۸۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۲۱

۲۹۔ انتظار حسین، بستی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۹۰

۳۰۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ''ناول کی عظمت''، لاہور، ماہ نامہ ''نقوش''، جولائی ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۳

۳۱۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۷، ص ۹۷

۳۲۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۴۔ شہزاد منظر، ناول، محولہ بالا ۸، ص ۴۸

۳۵۔ بشیر منصور، ''سقوطِ ڈھاکہ اور اردو ناول''، لاہور، ماہ نامہ ''سیارہ''، جون جولائی ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۷

۳۶۔ جیون خان، دو پتی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۶۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۱

۳۸۔ طارق اسماعیل ساگر، لہو کا سفر، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴۲

۳۹۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۷، ص ۱۷۲

۴۰۔ طارق اسماعیل ساگر، لہو کا سفر، محولہ بالا ۳۸، ص ۱۲۸

۴۱۔ رؤف ظفر، ماتمِ شہرِ آرزو، محولہ بالا ۲۳، ص ۳۰۰

۴۲۔ طارق اسماعیل ساگر، وطن کی مٹی گواہ رہنا، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۲۳

۴۳۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۲۱۳

۴۴۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا ۳۲

۴۵۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا۱۱، ص۳۵

۴۶۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا۱۰، ص۲۷

۴۷۔ طارق اسماعیل ساگر، لہو کا سفر، محولہ بالا۳۸، ص۳۰۴

۴۸۔ ظفر پیامی، فرار، نئی دلی، ناولستان، ۱۹۸۶ء، ص۱۹

۴۹۔ ایضاً، ص۳۸

۵۰۔ ایضاً، ص۲۱

۵۱۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا۱۷، ص۵۵۳

۵۲۔ غلام الثقلین نقوی، ''اردو کہانی کے پچاس سال''، لاہور، ماہ نامہ ''اوراق''، جولائی اگست ۱۹۹۷ء، ص۲۹

۵۳۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا۳۲، ص۲۱۳

۵۴۔ ایضاً، ص۳۳

۵۵۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا۱۷، ص۵۶۵

۵۶۔ جیون خان، دو پتی، محولہ بالا۳۶، ص۱۹۹

۵۷۔ طارق اسماعیل ساگر، لہو کا سفر، محولہ بالا۳۸، ص۱۵۵

۵۸۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا۲۹، ص۱۸۰

۵۹۔ انتظار حسین، بستی، محولہ بالا۲۹، ص۱۸۰

۶۰۔ ایضاً، ص۱۸۶

۶۱۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا۳۲، ص۵۱۲، ۵۱۱

۶۲۔ جیون خان، دو پتی، محولہ بالا۳۶، ص۲۵۵

۶۳۔ انتظار حسین، بستی، محولہ بالا۲۹، ص۱۹۱

۶۴۔ جیون خان، دو پتی، محولہ بالا۳۶، ص۲۳۲، ۲۳۱

۶۵۔ قرۃ العین حیدر، چاندنی بیگم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص۳۷۰

۶۶۔ ڈاکٹر خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵، ص۲۱۸

۶۷۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا۱۱، ص۱۹۰، ۱۸۹

۶۸۔ ایضاً، ص۱۲۰

۶۹۔ ایضاً، ص۲۶۹

۷۰۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱، ص ۱۹۲

۷۱۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری۔فنی جائزہ، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵

۷۲۔ ڈاکٹر انور سدید، برسبیلِ تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۳

۷۳۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۴

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۵۹

۷۵۔ توصیف، ''مجھے کیا کیا یاد آیا''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، جنوری فروری ۱۹۷۳، ص ۵۱

۷۶۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، محولہ بالا ۷۳، ص ۳۱۷، ۳۱۶

۷۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر، پاکستان میں اردو ادب، سال بہ سال ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۸ء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۱

۷۸۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، نئی تنقید، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۵

۷۹۔ ڈاکٹر خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، محولہ بالا ۶۲، ص ۱۵۴

۸۰۔ ڈاکٹر انور سدید، ''سیاسی معاشرے کا ناول۔فرار''، لاہور، ماہ نامہ ''اوراق''، جنوری فروری ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۲

۸۱۔ جیون خان، دپتی، محولہ بالا ۶۳، ص ۱۱۹

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۸۳۔ ایضاً، ص ۵۱

۸۴۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۸۶۔ راقم کی جیون خان کے ساتھ ایک گفتگو، بہ مقام لاہور، بہ تاریخ ۱۵ مارچ ۲۰۰۶ء

۸۷۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۶۰ء، ص ۲۷، ۲۶

۸۸۔ راقم کی سلمیٰ اعوان کے ساتھ ایک گفتگو، بہ مقام لاہور، بہ تاریخ ۸ مارچ ۲۰۰۶ء

۸۹۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۹

۹۰۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، محولہ بالا ۷۳، ص ۶۵

۹۱۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۰۴

۹۲۔ جیون خان، دپتی، محولہ بالا ۶۳، ص ۱۷۵

۹۳۔ قرۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہم سفر، لاہور، چوہدری اکیڈمی، ص ۱۶۳

۹۴۔ سید وقار عظیم، فن اور فن کار، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۲۶ء، ص ۱۴

۹۵۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ادبی تخلیق اور ناول، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء، ص ۶۴

۹۶۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ناول کیا ہے، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴، ص ۵۵

۹۷۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، محولہ بالا ۷۸، ص ۲۳

۹۸۔ ڈاکٹر خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول محولہ بالا ۶۲، ص ۲۱۹

۹۹۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۳۰۶

۱۰۰۔ راقم کی سلمیٰ اعوان کے ساتھ گفتگو، محولہ بالا ۸۸

۱۰۱۔ سلمیٰ اعوان، تنہا، محولہ بالا ۱۰، ص ۴۰۸

۱۰۲۔ بشیر احمد، سقوطِ ڈھاکہ اور اردو ناول، محولہ بالا ۶، ص ۶۰

۱۰۳۔ جیون خان، دپتی، محولہ بالا ۶۳، ص ۱۴۰، ۱۳۹

۱۰۴۔ سراج منیر، بشارتوں کے درمیان، محولہ بالا ۷، ص ۳۶۹

۱۰۵۔ انتظار حسین، بستی، محولہ بالا ۲۹، ص ۹۹

۱۰۶۔ پروفیسر عبدالمغنی، قرۃ العین حیدر کا فن، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۵

۱۰۷۔ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۵

۱۰۸۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، اردو میں تاریخی ناول نگاری، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔ شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۵۷۶

۱۰۹۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۱، ص ۲۷۷

۱۰۰۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادب، کلچر اور مسائل، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶

۱۱۱۔ سہیل بخاری، محولہ بالا ۷۸، ص ۱۶، ۱۵

۱۱۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''پاکستان کا تخلیقی منظر نامہ''، لاہور، ماہ نامہ ''ماہِ نو''، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۸

باب سوم

افسانے پر اثرات

اردو ادب ہر دور میں مختلف اصناف کے ذریعے فرد اور معاشرے کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ ادیب کی نظر نہ صرف فرد یا معاشرے کے خارجی پہلوؤں تک محدود رہتی ہے بلکہ وہ ان کے داخل میں اتر کر ایسے پہلوؤں کا اظہار بھی کرتا ہے جو عام فرد کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ شہزاد منظر کے بقول:

''ادیب معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہونے کی وجہ سے اپنے دور کے سماجی امور کے بارے میں دوسروں سے زیادہ ادراک رکھتا ہے اور اپنے دور کے بارے میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے اسی لیے ہر دور اور معاشرے میں ادیب ایک ذمہ دار اور محبِ وطن شہری کی حیثیت سے اپنے دور کے سماجی اور سیاسی معاملات کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ اور موقف رکھتا ہے۔''[۱]

گویا ادیب ایک عہد کا مصور ہوتا ہے اور اس کی تحریروں کے ذریعے ایک عہد کا مکمل عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک عہد کے سیاسی و سماجی نظریات، علم و دانش اور اندازِ فکر کو دوسرے عہد میں منتقل کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ادب کو، ایک نسل کے تجربات دوسری نسل تک منتقل کرنے کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میرے لیے عصری آگہی کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے۔ خواہ وہ نثر میں ہو یا شعر میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل بات یہ ہے کہ لفظ ایک نسل کے تجربہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کا پل بنتا ہے۔''[۲]

ہم جب اردو افسانے کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اردو افسانہ اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کی کامیاب عکاسی کرتا چلا آیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول ''جہاں تک عصری آگہی، روحِ عصر کی ترجمانی اور وقت کی پکار پر کان دھرنے کا تعلق ہے تو اردو افسانہ پہلے دن سے ہی درست راستہ پر گامزن نظر آتا ہے۔''[۳]
ڈاکٹر رشید امجد اردو افسانے کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آج کا اردو افسانہ فکری اور فنی دونوں سطحوں پر اپنی پہچان کرا رہا ہے۔ پاکستانی سماج کی عصری تصویر کشی اور جبر و تشدد کی فضا کے ساتھ ساتھ آدرشوں اور اجتماعی خوابوں کو بھی اپنے اندر سمو رہا ہے۔''[۴]

ہمیں اردو افسانے میں قیامِ پاکستان سے پہلے کا دور، تحریکِ قیامِ پاکستان، قیامِ پاکستان کے بعد کے

حالات، ۱۹۶۵ء کی جنگ سے لے کر ۱۹۷۱ء کے المیہ مشرقی پاکستان سمیت تمام تاریخی، سماجی، تہذیبی اور انسانی پہلوؤں کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان ہماری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے کہ جس کے بارے میں اردو کی کئی اصناف میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں کے ذریعے قاری تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ شہزاد منظر کے بقول:

> ''گذشتہ دس برسوں کے افسانے سے بحث کرتے ہوئے سانحہ مشرقی پاکستان کو نظر انداز کردینا کسی حال میں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان ہماری قومی تاریخ کا ناقابل فراموش المیہ ہے جس کا اردو افسانے پر گہرا اور براہِ راست اثر مرتب ہوا ہے اور اس سانحہ سے متاثر ہو کر اردو میں کئی لافانی افسانے لکھے گئے ہیں۔''[۵]

سقوطِ مشرقی پاکستان کے اثرات اردو کے نثری ادب میں سب سے پہلے افسانے پر پڑے۔ افسانہ ایک ایسی نثری صنف ادب ہے جس کے ذریعے لکھنے والوں نے یہ سانحہ رونما ہونے سے پیشتر ہی اپنے جذبات و احساسات اور اس کے رونما ہونے کے خدشات کا اظہار کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر آغا سہیل کا افسانہ ''پرچم'' اور غلام محمد کا افسانہ ''ایک سہا ہوا شخص'' دسمبر ۱۹۷۰ء کے ماہ نامہ ''فنون'' میں شائع ہوئے جن میں حالات کی عکاسی کی گئی تھی۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعروں کی طرح اردو افسانہ نگاروں نے بھی یہ سانحہ رونما ہونے سے پہلے اس کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ حالات جو رخ اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں، ان کا لازمی نتیجہ کس صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔ خالد اقبال یاسر، سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے، اس موضوع پر لکھنے والے افسانہ نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''زوالِ ڈھاکہ سے پہلے محی الدین نواب، مسعود اشعر، غلام محمد اور زین الدین نے اپنے افسانوں میں بنگال کی تصویر کشی کی۔ ان کے افسانے آئندہ خطرات کی قبل از وقت پیش بینی کرتے تھے۔''[۶]

سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ رونما ہونے سے پہلے، مشرقی پاکستان میں بسنے والے اردو ادیبوں کی کچھ تعداد، ہجرت کر کے مغربی پاکستان آ گئی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف بنگالیوں کے اندر جنم لینے والی نفرت اور انتقام کا مشاہدہ کر چکے تھے بلکہ اس کا شکار بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی پاکستان کے لوگوں کو مشرقی پاکستان کی صحیح صورتِ حال کا عکس دکھایا۔ سلیم آغا قزلباش کے بقول:

> ''بنگلہ دیش بننے سے قبل مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان منتقل ہو جانے والے بہاری

مسلمان ادیبوں نے بطور خاص اس سانحے پر قلم اٹھایا جو اس کشمکش، بغاوت، تصادم، نفرت اور بداعتمادی کو واضح کرتا تھا جو مشرقی پاکستان کے عوام کے دل و دماغ میں زہر بن کر پھیل رہی تھی۔''[۷]

انھوں نے سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کے حالات کا جائزہ لیا اور قوم کو خبردار کیا کہ اس حادثے سے بچنے کے لیے سوچ میں کس تبدیلی کی ضرورت ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے، اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں کی تعداد کم ہے مگر ان کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے اس قومی سانحے کے رونما ہونے سے پہلے، اس حادثے کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی۔

سانحۂ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھنے والوں میں ملک کے دونوں حصوں کے افسانہ نگار شامل تھے۔ مغربی پاکستان کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، ممتاز مفتی، انور سجاد، اختر جمال، فرخندہ لودھی، نشاط فاطمہ اور قیصر قیصری کے نام اہمیت کے حامل ہیں جب کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والوں میں ام عمارہ، غلام محمد، شہزاد منظر، علی حیدر ملک، ایوب جوہر، محمد واجد، احمد زین الدین، محی الدین نواب، افسر ماہ پوری، نورالہدیٰ سید، ش۔ م۔ ساجد، احمد سعدی، حیدر صفی، انیس صدیقی، شبنم یزدانی، ذاکر عزیری، شاہد کامرانی، نزہت نوری، رحمٰن شریف اور شہناز پروین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اگر تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مذکورہ موضوع پر لکھنے والوں میں مشرقی پاکستانی ادیبوں کی تعداد زیادہ ہے جنھوں نے اس سانحے کا براہ راست مشاہدہ کیا اور وہ خود ذاتی طور پر ان حالات سے گزرے اور اپنے محسوسات اور مشاہدات کو انھوں نے افسانوں کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کیا جب کہ مغربی پاکستان کے افسانہ نگاروں نے جغرافیائی دوری کے سبب اس سانحے کی شدت کو اس انداز میں محسوس نہیں کیا۔ تاہم تعداد کی کمی کے باوجود ان کے افسانوں میں قومی اور انسانی دکھ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کو ایک حساس، صاحبِ بصیرت اور محبِ وطن پاکستانی کے طور پر محسوس کیا اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کر کے اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ ان افسانوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''پاکستانیت کے حوالے سے بھی ہمارا افسانہ، دیگر اصناف یہاں تک کہ ناول کے مقابلے میں بھی زیادہ باثروت ہے۔''[۸] ڈاکٹر معین الدین عقیل ان افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس المیہ پر لکھے جانے والے افسانے اپنے احساس و تاثر کے لحاظ سے زیادہ گہرے اور پاکستانیت سے اپنے رشتے کے حوالے سے زیادہ قریب بھی ہیں۔ ان میں پایا جانے والا درد واحساس پوری قوم کے درد واحساس کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔''[۹]

اردو کی باقی اصناف کی طرح افسانے میں بھی ہمارے ادیبوں نے جہاں اس سانحے پر قوم کے حقیقی جذبات

واحساسات کی ترجمانی کی وہاں اس سانحے کے پس پردہ حقائق سے پردہ بھی اٹھایا۔انھوں نے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اس سانحے کے ان پہلوؤں کا مطالعہ کیا جو مؤرخ کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔مسعود مفتی کے بقول:

''مؤرخ اور صحافی بلند پرواز پرندے کی طرح زلزلوں کا مجموعی نظارہ کرتے ہیں مگر ادیب گلی گلی گھومنے والے سیاح کی طرح دروازوں پر دستک دیتا ہے اور افراد کے چہروں کو پڑھتا ہے۔اسی لیے کسی بھی انقلاب کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک مؤرخ اور صحافی کے ساتھ ادیب کا قلم بھی حرکت میں نہ آئے۔۔۔۔مؤرخ اور صحافی صرف انقلاب کا دسواں حصہ دکھاتے ہیں اور ادیب اس کے وہ نو حصے بھی دکھاتا ہے جو سطح سے نیچے ہیں اور بعد میں آنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔''۱۰

ہمارے افسانہ نگاروں نے جہاں بطور قومی سانحہ اس المیے کا جائزہ لیا وہاں بطور انسانی المیہ بھی اس کا مطالعہ ومشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو قاری کے سامنے پیش کیا۔چنانچہ ان افسانوں میں ادیبوں نے اس قومی حادثے کے سبب متاثر ہونے والے انسانوں کی ذاتی زندگیوں کا عکس بھی پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان افسانوں میں جہاں ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آنے والے دنوں کے لیے یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ ہم دشمن کی چالوں سے باخبر رہ کر خود کو بچائیں اور اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق پیدا کریں۔

کسی ایک افسانے میں،اس کے اختصار کے باعث،کسی بڑے ہمہ پہلو واقعے کی تمام جہتوں کا مطالعہ کرنا تو محال ہوتا ہے تاہم مختلف افسانوں کے مطالعے کے ذریعے کسی بڑے واقعے کے بطن سے جنم لینے والے مختلف پہلوؤں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔یہی صورت حال سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔تاہم افسانہ نگاروں نے ان افسانوں کے ذریعے اس سانحے کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید اردو افسانے پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پاکستان کی سماجی زندگی پر کرب کا ایک اور لمحہ ۱۹۷۱ء میں اس وقت سامنے آیا جب مشرقی پاکستان میں علاحدگی کے رجحانات فروغ پانے لگے اور مارشل لاء کی انتظامیہ اس مسئلے کو سیاسی طور پر حل کرنے میں ناکام ہوگئی۔یہ دور خارجی اضطراب اور داخلی پریشانی کا مظہر ہے۔سیاسی منافرت اور علاقائی تعصب نے انسانی زندگی میں خلل ڈال دیا۔ پاکستانی افسانہ نگاروں نے اس دور کے اضطراب'' انتشار'' بے بسی اور پریشانی کو اپنے تجربے کا جزو بنایا اور چند ایسے افسانے تخلیق کیے جن سے اس دور کا المیہ پوری طرح سامنے

آجاتا ہے۔''[۱۱]

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے تو اپنے افسانوں میں قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کی تاریخ قاری کے سامنے اس طرح بیان کر دی ہے کہ قاری تمام حالات و واقعات کی جھلکیاں دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے اور انھیں آسودہ زندگی گزارنے کا موقع مل سکے گا۔ ابراہیم جلیس کے افسانے ''الٹی قبر'' میں ایک خاندان انھیں تصورات کو اپنے دل میں بسائے مشرقی پاکستان کا رخ کرتا ہے۔ افسانے کا ایک کردار عبدالوحید ہجرت کے وقت اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے پاکستان سے وابستہ اپنی توقعات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''بس اب ڈھاکہ پہنچنے کی دیر ہے عاشو! پھر ہمیں نئی زندگی ملے گی۔ قائداعظم نے کہا ہے کہ پاکستان صرف غریب مسلمانوں کی خوش حالی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اب پاکستان میں کوئی مسلمان غریب یا تنگ دست نہیں ہوگا۔ وہاں ڈھاکہ میں ہمارا ذاتی مکان ہوگا جہاں سے پٹنہ کے مالک مکان لالہ گھنشیام داس کی طرح کوئی سنگ دل ظالم بنیا ہمیں اپنے مکان سے ہرگز کبھی بھی نکال نہیں سکے گا۔''[۱۲]

افسانہ ''مکتی'' میں شہناز پروین نے ایک کردار ''مکتی'' کے ذریعے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد کے دنوں کے حالات کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان پہنچتی ہے مگر کچھ ہی عرصے بعد وہاں کے حالات ایک نیا رخ اختیار کرنے لگتے ہیں۔

''اتنے میں دوسری لڑکیاں جلوس کے لیے منظم ہوتی نظر آئیں، وہ کلاس روم سے باہر نکلی اور اس کے کانوں سے اپنے ہی ملک اور اپنے ہی رہنماؤں کے خلاف نعرے ٹکرائے تو اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے جسم سے جان نکال رہا ہو۔ اسے ایسے معلوم ہوا جیسے جلوس میں شامل اس کے ہم وطن ''مکتی مردہ باد'' چلا رہے ہوں۔ اس نے سوچا، پاکستان نہیں تو وہ کہاں، وہ تو واقعی اپنے آپ کو پاکستان کا حصہ سمجھتی تھی۔''[۱۳]

آگے چل کر افسانہ نگار نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء اور پھر دسمبر ۱۹۷۱ء کو رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں اسے ایک بار پھر ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ آغا سہیل کا افسانہ ''پرچم'' بھی ۱۹۴۷ء سے لے کر مشرقی پاکستان کی علاحدگی تک کے دنوں کی عکاسی کرتا ہے مگر اس کا مرکزی موضوع معاشی مسائل اور غربت کی

چکی میں پستے افراد ہیں۔ افسانے کے آغاز میں اس کا مرکزی کردار قیامِ پاکستان کے دنوں کو یاد کرتا نظر آتا ہے۔

''تیئیس سال قبل کیا ہوا تھا۔ یہ بھی اسے اب کچھ خواب سا یاد رہ گیا تھا کہ ایک ٹرین میں بہت سے مردوں اور عورتوں کے درمیان وہ سفر کر رہا تھا اور پھر ٹرین کہیں رکی ہوئی تھی۔ پھر بڑا کشت وخون ہوا تھا۔ خون کی چادریں کی چادریں اس پر سے گزر گئی تھیں۔ انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ لاتعداد لاشیں جلی پڑی تھیں اور دور دور تک تعفن اور بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں لاشوں کے درمیان کہیں وہ بھی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔''[۱۴]

سیاسی حالات بدل جاتے ہیں اور ملک میں افراتفری پھیل جاتی ہے تو یہ شخص بھی ایک جلسے کے دوران تقسیم ہوتے ہوئے پرچم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا مدعا کچھ اور ہوتا ہے۔

''اسے بولتے ہوئے دیکھ کر پرچم تقسیم کرنے والا بولا، ''کیا تم کھوکھے پر پرچم لگاؤ گے؟''
اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''میں اس کی قمیص بنوا کر پہنوں گا۔'' اس نے ہجوم کو اپنا ننگا بدن دکھاتے ہوئے کہا، ''دیکھو مجھے سردی لگتی ہے۔''
ہجوم میں پھر قہقہے لگے اور ایک آدمی نے اسے پرے دھکیل دیا۔''[۱۵]

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے مگر حالات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کا حب الوطنی کا جذبہ، آزادی اور قومی پرچم کا تصور لباس تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان کی داستان کے حوالے سے شہزاد منظر کا افسانہ ''یوٹوپیا'' نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی کہانی ایک ایسے فرد کے اردگرد گھومتی ہے جو قیامِ پاکستان کے لیے جدوجہد میں مصروف نظر آتا ہے اور اس کے دل میں پاکستان سے محبت کا جذبہ رچا ہوا ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد یہ کردار ہجرت کر کے آنے والے لوگوں میں شامل نہیں ہوتا مگر کچھ عرصے بعد امن، سکون اور بہتر مستقبل کی تلاش میں ہندوستان سے مشرقی پاکستان ہجرت کر کے آ جاتا ہے تو اس وقت تک وہاں کے حالات بدل چکے ہوتے ہیں اور وہاں علاحدگی کی تحریک کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے۔

''قوم پرست سیاست دانوں نے مقامی اور غیر مقامی باشندوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ کرنافلی اور آدم جی نگر میں بنگالی اور غیر بنگالی باشندوں کے درمیان بڑے پیمانے پر خونی تصادم ہو چکا تھا اور گزشتہ دس برسوں میں صوبائی عصبیت اور منافرت کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچ چکی تھیں اور اب کھلم کھلا مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی باتیں کی جانے لگی تھیں۔''[۱۶]

آہستہ آہستہ حالات اس مقام تک پہنچ گئے کہ غیر بنگالیوں کے لیے زندگی محال ہوگئی۔ اسد فیض، شہزاد منظر کے اس افسانے کے اس مرکزی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بنگالی اور غیر بنگالی فسادات کے دوران اس کے والدین ہلاک اور بہن اغوا کر لی جاتی ہے جس کا جمیل کو اتنا صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ پاکستان کے بارے میں وہ جو سنہرا خواب لے کر آیا تھا وہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔'' ۱۷ے

ان حالات سے تنگ آ کر یہ کردار واپسی کا سفر اختیار کر لیتا ہے تو راستے میں ایک پڑاؤ پر اس کی ملاقات قافلے میں موجود ایک دوست سے ہوتی ہے جو امن کی تلاش میں مشرقی پاکستان کا رخ کیے جا رہا ہوتا ہے۔

''تھوڑی دیر کے بعد دونوں قافلے اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ روانگی کے وقت دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے، دونوں کی آنکھیں بھر آئیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو روندھی ہوئی آواز میں الوداع کہا۔ دونوں اپنے اپنے قافلے کے ساتھ مستقبل کی تلاش میں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ایک قافلہ سرحد عبور کر کے آ چکا تھا اور دوسرا قافلہ سرحد عبور کرنے کے لیے جا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہم امن اور مستقبل کی تلاش میں اسی طرح بھٹکتے پھریں گے؟'' ۱۸ے

قیامِ پاکستان اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے اس افسانے میں افسانہ نگار انسان کے اس بنیادی المیے کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کا بنیادی مسئلہ تو سکون، امن اور بہتر مستقبل کی تلاش ہے اور وہ ساری زندگی ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے مگر اس زمانے میں تو یہ چیزیں یوٹو پیا کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔

قیامِ پاکستان اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو سکون اور امن کے متلاشی ان لوگوں میں بہاری افراد سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ قیامِ پاکستان کے وقت اپنا وطن چھوڑ کر اور سب کچھ قربان کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہوئے اور آخری دم تک پاکستان کی سالمیت اور سلامتی کے لیے کوشاں رہے، مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد یہ لوگ ایک نئی خوف ناک صورت حال سے دوچار ہو گئے۔ وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر آ بسے تھے مگر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد ان پر زندگی کے تمام تر راستے مسدود ہو کر رہ گئے۔ واپسی ممکن نہ تھی، بنگلہ دیش کی سرزمین انھیں قبول کرنے کو تیار نہ تھی اور مغربی پاکستانی حکمرانوں کے دلوں میں ان کے لیے کوئی جگہ موجود نہ تھی۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے ادب کا ایک اہم موضوع انھیں لوگوں کا المیہ ہے جو ۱۹۷۱ء سے لے کر آج تک کسی ملک کے شہری نہیں اور بنگلہ دیش کے مہاجر کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ لوگ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی تحریک میں پاکستان کی سالمیت

کے حامی رہے چنانچہ علاحدگی پسند بنگالیوں کی نظر میں غدار ٹھہرے، جو قابل اعتبار نہ تھے۔ ابراہیم جلیس کے افسانے ''الٹی قبر'' کا ایک کردار عائشہ بھی اسی مسئلے سے دوچار نظر آتی ہے۔

''مگر ۲۴ سال آرام سے ہنستے بولتے اور بالکل بنگالن کی طرح رہتے رہتے اچانک ایک دن عائشہ کو یاد دلایا گیا کہ وہ بنگالن نہیں، بہاری ہے۔ وہ ڈاٹر آف سوائل نہیں۔ چوبیس سال گزر جانے کے باوجود بھی غیر ملکی ہے۔'' ۱۹

علی حیدر ملک کا افسانہ ''پسپائی کا آخری موڑ'' بھی اسی المیے کا شکار لوگوں کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو مشرقی پاکستان کی نئی سرزمین پر نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے مگر اسے مقامی لوگ برداشت کرنے کو تیار نہ ہوئے اور ایک دن اسے وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار علامتی انداز میں اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''وہاں پہنچ کر میں نے سونے کے محل کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر شروع کر دی۔ جیسے جیسے محل کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں اس کے نقش ونگار واضح ہوتے گئے، وہ میری کاریگری اور مہارت کے قائل ہوتے گئے۔ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد آخر کار وہ محل مکمل ہو گیا۔ وہ سب بہت خوش ہوئے اور خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔ جشن کی محفل ختم ہوئی تو میں تھکن سے چور ہو کر وہیں محل کے ایک سائبان میں سو گیا۔ نہ جانے کب تک یوں ہی سوتا رہتا کہ معاً کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھا دیا۔

''ارے یہ یہاں کیوں سویا ہوا ہے۔ ہمارے محل پر قبضہ کرے گا کیا؟'' سانولے رنگ کے ایک دبلے پتلے آدمی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

''نکالو نکالو۔ اسے یہاں سے نکالو''، بہت سی آوازیں کھلے خنجر کی طرح فضا میں لہرانے لگیں۔

''بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں'' ہوا میں تیر سنسنانے لگے۔

میں نے بہت منت سماجت کی۔ ہاتھ پاؤں جوڑے، پاؤں پکڑے لیکن انھوں نے میری ایک بھی نہ سنی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے گھسیٹنے لگے۔ انھوں نے مجھے اتنا گھسیٹا اتنا گھسیٹا کہ میرا سارا وجود لہو میں تر ہو گیا۔'' ۲۰

امِ عمارہ کا افسانہ ''بے گناہی بے گناہی'' بھی زبان کے مسئلے سے جنم لینے والی اسی مغائرت کا قصہ بیان کرتا ہے

جس کا نتیجہ قتل و غارت کی صورت میں نکلا۔ امِ عمارہ اس افسانے کے ذریعے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ مہاجرین کو بہت جلد اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ وہ اس معاشرے کا حصہ بننے کی جتنی بھی کوششیں کر لیں، یہ زمین انھیں قبول نہیں کرے گی۔

''''پھر کیا ہوا بابا! جب ہمیں یہیں رہنا ہے اور اسی مٹی میں مل جانا ہے تو پھر ہماری جڑیں اسی طرح یہاں مضبوط ہو سکتی ہیں۔'' بڑے بھیا نے بابا کی بات کاٹی۔ ''تم کہہ سکتے ہو بیٹے ورنہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس مٹی کا پیوند بن جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پیوند، پیوند ہی رہے گا۔'''' ۲۱

مسعود اشعر کے افسانے ''دکھ جو مٹی نے دیے'' کا مرکزی کردار بھی اسی مسئلے سے دوچار نظر آتا ہے جسے صدی کا ایک چوتھائی حصہ گزر جانے کے بعد بھی بار بار اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اس زمین کا بیٹا نہیں بلکہ اسے سوتیلی ماں نے جنم دیا ہے۔

''''اور جو کیڑا زمین کے ہم رنگ نہیں ہوتا؟''

''وہ ہمیشہ خطرہ میں رہتا ہے'' پھر ایک قہقہہ پڑا۔

''مگر ایسا کیڑا غیر محفوظ ہو تو وہ پناہ کہاں تلاش کرے؟'' میں نے چلتے چلتے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن میرا سوال انھوں نے بھی سن لیا تھا اس لیے ان سب نے مل کر جواب دیا۔

''اپنی ماں کی گود میں''

اس جواب کے ساتھ ہی میرے پاؤں پھر زمین پر سے اکھڑ گئے تھے اور میں خلا میں بھٹکنے لگا تھا۔'' ۲۲

مسعود اشعر نے زمین سے اکھڑے ان لوگوں کی کیفیت کا اظہار کیا ہے جو اپنی ماں کی گود سے بچھڑ گئے تھے اور دوسری ماں نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کے باطن کی دنیا میں جو بھونچال آیا، مسعود اشعر کے افسانے اس کے بہترین عکاس ہیں۔ انتظار حسین کے بقول:

''خارج کی سطح پر جو کچھ ہوا وہ ہوا مگر یہاں لگتا ہے کہ باطن کی سطح پر زیادہ بڑا سانحہ گزرا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے بڑا سقوط۔ سارا نقشہ تتر بتر ہے۔ تصویریں ادھوری اور غیر واضح۔ لگتا ہے کہ اندھیرے میں چل رہے ہیں۔ بار بار کوئی تکلیف دہ سوال رستہ کاٹتا ہے۔'' ۲۳

اختر جمال کے افسانے ''دوسری ہجرت'' کا مرکزی موضوع بھی ہجرت در ہجرت کے المیے سے دوچار انھیں لوگوں کا المیہ ہے۔ یہ ایک ایسے خاندان کی داستان ہے جو ۱۹۴۷ء میں کلکتے سے ڈھاکہ پہنچتے ہیں تو اپنے حق میں

دعائے خیر کی دعا مانگ کرنئی سرزمین پر زندگی کے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

''جب وہ کلکتے سے ڈھاکہ پہنچے تو نئی زمین پر قدم رکھتے ہی سب نے ''بسم اللہ'' کہا۔ دادی زورزور سے پکار پکار کر بچوں سے کہہ رہی تھیں کہ ''اللہ کا نام لے کر قدم رکھو'' اور پھر جب وہ اسٹیمر سے نیچے اتریں تو انھوں نے دعا مانگی ''یاالٰہی تیری رضا سے اپنے گھر بار عزیز رشتہ دار اپنا وطن چھوڑ کر آ رہے ہیں۔ تیرے پاک نبی کی سنت پر ہم نے ہجرت کی ہے۔ نئی زمین ہمارے لیے مبارک کرنا۔'' ۲۴؎

مگر تھوڑے ہی عرصے میں بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق ابھر کر سامنے آنے لگی۔ زبان کے مسئلے پر آغاز ہوا اور پھر حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ اس کنبے کو مشرقی پاکستان سے ہجرت کرنا پڑی۔

''منشی سرفراز حسین سوچنے لگے کہ اب یہاں سے جانے کی بات بہت افسوسناک اور غلط ہے۔ آخر ایک دو نہیں ہزاروں لوگ ہیں بہار کے، یوپی اور سی پی کے۔ آخر کیا ان سب کو جانا ہوگا۔ یہ سب کیسے جائیں گے؟ کہاں جائیں گے؟ اور اگر یہاں سے جا کر کہیں اور بس گئے تو پھر ایک دن وہاں سے بھی جانا پڑا تو پھر۔۔ پھر کیا ہوگا۔'' ۲۵؎

مگر مشرقی پاکستان کی سرزمین پر حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور غیر بنگالیوں کے لیے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر ایک دن وہ بھی آ گیا جب منشی سرفراز حسین کو دوسری ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھنا پڑا۔

''صدمے، نقاہت اور ضعف سے منشی سرفراز حسین کے جسم پر لرزا طاری تھا۔ وہ سب ہوائی جہاز میں بیٹھ گئے۔ منشی سرفراز حسین کی بوڑھی آنکھیں حدِ افق تک دیکھتی رہیں۔'' ۲۶؎

شہزاد منظر، جو خود بھی دو بار ہجرت کے تکلیف دہ عمل سے گزرے، بھی اپنے مختلف افسانوں کے ذریعے، ہجرت کے مارے اُن لوگوں کا المیہ مختلف کہانیوں کے ذریعے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''پچھتاوا'' ایک ایسے شخص کی الم ناک داستان ہے جو کلکتہ سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہوتا ہے، وہاں کی زندگی کا حصہ بننے کی کوشش کرتا ہے مگر غیر بنگالی ہونے کے باعث اسے ایک دن وہاں سے بھی ہجرت کر کے مغربی پاکستان آنا پڑتا ہے اور پھر زندگی کے سولہ برس یہاں گزارنے کے باوجود ایک دن اسے احساس ہوتا ہے کہ یہاں کی سرزمین بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں۔ ان کا دوسرا افسانہ ''اب ہم کہاں جائیں گے ماں'' کا مرکزی کردار بھی لسانی فرق کے عذاب میں مبتلا ایک ایسا فرد ہے جو مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی ہونے کے باعث خوف و ہراس کا شکار ہے اور اسی خوف کے باعث ایک دن دوسری بار اپنا گھر بار چھوڑ کر کھٹمنڈو کے راستے مغربی پاکستان پہنچ جاتا ہے مگر لسانی فسادات یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ان ہی ہنگاموں کا شکار ہو کر وہ زخمی حالت میں ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ وہ ہوش میں آ کر اپنی ماں کو دیکھ

کر بے اختیار اس سے لپٹ جاتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ ''اب ہم کہاں جائیں گے ماں۔'' اسی طرح ان کے افسانے کا ایک اور کردار جب دوسری ہجرت کے عمل سے گزرتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت اور اپنا وطن چھوڑنا ہی ان کی حقیقی غلطی تھی۔

''اس نے کہا عجیب پاگل لڑکی ہے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا مقدر تھا۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ سو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ہم سب تاریخی جبریت کا شکار ہیں یا پاگل۔ ہمیں تو اس پر ہنسنا چاہیے، ان حالات پر ہنسنا چاہیے جن کے تحت ہم نے اپنا وطن چھوڑا اور اس خطۂ امن کو اپنا وطن سمجھا۔ ان لمحوں پر ہنسنا چاہیے جب ابو نے اس سرزمین سے محبت کی، اس کی زبان و تہذیب کو اپنایا، پھر بھی اس سرزمین نے انھیں قبول نہیں کیا۔'' ۲۷

سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی تحریروں میں شہزاد منظر کی تحریریں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ محمد عثمان رمز کے مطابق:

''سقوطِ ڈھاکہ سے متعلق جو کہانیاں ہیں اور ان کو شہزاد منظر نے جس خونِ جگر سے لکھا ہے اس کے باعث وہ کہانیاں زندہ رہیں گی۔ ان کا یہ مجموعہ پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد پاکستان کے باسیوں کے لیے تحفہ ہے جس میں حقیقت بھی ہے اور افسانہ بھی، تاریخ بھی ہے اور سیاست بھی، صدا بھی ہے اور صدائے بازگشت بھی۔'' ۲۸

انتظار حسین کے افسانوی مجموعے ''شہرِ افسوس'' کے اکثر افسانے بھی مشرقی پاکستان کے المیے سے جنم لینے والے مسائل بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ''شہرِ افسوس'' کی کہانیوں کے بارے میں ڈاکٹر شفیق انجم کا کہنا ہے۔

''ان کہانیوں کا بنیادی نقطہ اس مجموعے کے عنوان سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ عدم شناخت، گم شدگی، لاحاصلی اور کھوئے جانے کا افسوس، پاکستانی معاشرے کے اس تجربے کی بازیافت ہے جو اس عہد میں سیاسی و سماجی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ طویل مشقت کے بعد خالی رہ جانے والوں کی کہانیاں ہیں۔'' ۲۹

انتظار حسین کا لازوال افسانہ ''شہرِ افسوس'' بھی اپنی زمین سے بچھڑے ان لوگوں کا المیہ بیان کرتا ہے جو اپنے گھر بار چھوڑ کر دارالامان کی تلاش میں مشرقی پاکستان میں آ بسے تھے مگر یہاں آ کر اپنوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔

''یہ سن کر ہنسی میری جاتی رہی۔ میں نے افسوس کیا اور کہا اے بزرگ کیا تو نے دیکھا کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انہیں قبول نہیں کرتی۔''

''میں نے یہ دیکھا اور جانا کہ ہر زمین ظالم ہے''۔

''جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟''

''ہاں جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالامان بنتی ہے وہ بھی۔ میں نے گیا نام کے نگر میں جنم لیا اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے اور نروان کسی صورت میں نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔''[۳۰]

زمین کے بیٹوں کے ہاتھوں لٹے پٹے غیر بنگالیوں کو ۱۹۷۱ء میں ایک دفعہ پھر اسی صورت حال سے گزرنا پڑا جس سے وہ ۱۹۴۷ء میں گزر چکے تھے۔ انتظار حسین نے دوسری ہجرت کے کرب میں مبتلا ان افراد کے جذبات واحساسات کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

''تیسرا آدمی ایک تلخی سے ہنسا۔ کہنے لگا: '' آگے جب ہم نکلے تھے تو اپنے آباؤ اجداد کی قبریں چھوڑ آئے تھے۔ اب کے نکلے ہیں تو اپنی لاشیں چھوڑ آئے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی ہنسی معدوم ہوگئی اور ایک افسردگی نے اسے آلیا۔ اسے اپنا پہلا نکلنا یاد آگیا۔ ماضی کے دھندلکے میں اسے بہت سی صورتیں نظر آئیں۔ روشن چہروں کی ایک ندی تھی کہ اس کے تصور میں امنڈ آئی تھی۔ چہرے جو ایسے اوجھل ہوئے کہ پھر دکھائی نہیں دیے اور اب یہ دوسرا نکلنا اور اب پھر۔۔۔ اس نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ دل ہی دل میں کہا کہ یہ تو مجھے پتا نہیں کہ میں نکل آیا ہوں یا نہیں نکل آیا مگر بہت سے روشن چہرے پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ہیں۔''[۳۱]

بہاریوں کے مسئلے کے حوالے سے یہ پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والے بہاریوں نے بھی اپنے آپ کو بنگالیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ انھوں نے بنگالی تہذیب وثقافت اور زبان سے دوری اختیار کیے رکھی، اپنی الگ بستیوں میں بنگالیوں سے ہٹ کر ایک الگ گروہ کا تاثر دیا اور بنگالیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے اجتناب کیا۔ یہی سبب رہا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد بنگالیوں کے دلوں میں موجود نفرت کا جذبہ انتقام کی صورت میں سامنے آیا اور انھیں بنگالیوں کے ظلم کا شکار بننا پڑا۔ بیشتر افسانہ نگاروں نے اس پہلو پر کم توجہ دی ہے۔ انتظار حسین نے افسانے ''اندھی گلی'' میں مسئلے کے اس پہلو کا مختصر حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ درپیش صورت حال میں ہماری غلطیوں کا بھی حصہ ہے۔ وہ غیر بنگالیوں کے خلاف بنگالیوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی نفرت کی وجوہات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے ان کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ زبان کا فاصلہ، تہذیب

کا فاصلہ، ہم نے اس فاصلے کو پاٹنے اور انھیں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ انھوں نے ہمیں جانا نہ ہم نے انھیں پہچانا۔'' ۳۲؎

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں نے مشرقی پاکستان میں آکر یہاں کی تہذیب و ثقافت اور زبان اختیار کرنے اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی بجائے اپنے آپ کو ان لوگوں سے الگ تھلگ رکھا اور خود کو ان سے برتر خیال کیا جس کے ردِ عمل میں بنگالیوں کے دلوں میں ان کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ غلام محمد نے اپنے بعض افسانوں میں صورت حال کے اس دوسرے پہلو کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے افسانے ''اداسی'' کا ایک کردار اس صورت حال کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

''''نہیں آذر۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ یوپی کے رہنے والے ہیں، کہاں بنگالی، بھلا کیسے نبھے گی''؟

''کیوں''؟

''کلچر پر باتیں کرتے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ یوپی کا کلچر۔۔۔''

''بس کیجیے رحمٰن صاحب، بس کیجیے۔ یہی احساس برتری آپ لوگوں کو تباہ کر کے چھوڑے گا۔ اینگلو انڈین وغیرہ بھی خود کو ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب تصور کرتے تھے۔ پر دیکھتے نہیں کہ آج کیا عالم ہے۔ نہ انگریز انھیں اپنا کہتے ہیں نہ ہندوستانی۔ آپ لوگ بھی یوں ہی رہ جائیے گا۔ کچھ دنوں پر نہ یوپی آپ کو تسلیم کرے گی اور نہ مشرقی بنگال۔'' ۳۳؎

سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے مذکورہ پہلو کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کی اکثریت نے بہاریوں کے مسئلے کے صرف ایک پہلو کو دیکھا اور بیان کیا ہے تاہم چند افسانہ نگاروں نے تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر قاری کے سامنے حالات و واقعات کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔

مشرقی پاکستان کی علاحدگی جہاں ایک بڑا قومی سانحہ ہے وہاں یہ حادثہ انسانی دکھوں کی ان گنت داستانیں بھی اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان ہی انسانی مسائل میں سے بہاریوں کا مسئلہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مسئلہ اپنے اندر کئی سوال لیے ہوئے ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اس المیے کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اسے قومی اور ذاتی حوالوں سے دیکھا ہے اور ان لوگوں کی باطنی کیفیات کا تجزیہ پیش کیا ہے جو ہجرت کے کرب سے دوسری بار دوچار ہوئے۔

زبان کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جس نے مشرقی پاکستان کی علاحدگی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ملک کے دونوں حصے کے لوگوں میں نفرت کا آغاز اسی مسئلے سے ہوا جو آہستہ آہستہ پھیلتا گیا اور بالآخر ایک تحریک کی صورت اختیار

کر گیا جس کا انجام دونوں حصوں کی علاحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا ہے کہ جس نے مشرقی پاکستان کے اندر رہنے والے لوگوں میں بنگالی اور غیر بنگالی کی تقسیم پیدا کی اور قومی یکجہتی کے جذبے کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اختر جمال افسانے ''دوسری ہجرت'' میں اردو اور بنگلہ کے اس تنازعے کو اس طرح نمایاں کرتے نظر آتے ہیں۔

> ''بات تو ٹھیک نکلی۔ جگہ جگہ اردو اور بنگالی کی لڑائی اس طرح شروع ہوگئی جیسے کسی زمانے میں اردو اور ہندی کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اردو اور ہندی بھی ایک ماں کی دو بیٹیاں تھیں مگر انگریز بہادر نے اپنی حکمت عملی سے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا اور اب ان کے جانشین بنگلہ اور اردو کی لڑائی کا خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔'' ۳۴

قیصر قیصری نے بھی اپنے افسانے ''تھوتھو'' میں اسی مسئلے کی سنگینی کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ لوگ جو ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کو ماننے والے تھے محض اس بات پر ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کی زبان نہیں بولتا۔

> ''ادھر دیکھ'' میں نے تھوتھو سے کہا۔ ''یہ جو پہلی سڑک بائیں ہاتھ کو جاتی ہے، اس پر چندر گونا کے کارخانے ہیں اور اس سے آگے سیدھے سچے نیک اور دین دار مسلمانوں کی بستیاں ہیں۔ ان مسلمانوں نے کلمہ پڑھ پڑھ کر دوسرے مسلمانوں کا قتل کر دیا کیونکہ وہ دوسرے مسلمان ان کی زبان نہیں بولتے تھے۔ تو بھی میری زبان نہیں سمجھتا۔ کیا تو بڑا ہو کر مجھے قتل کرے گا تھوتھو؟'' ۳۵

انور سدید کا کہنا ہے کہ ''''تھوتھو'' میں قیصر قیصری نے چھوٹے چھوٹے بے نام کرداروں کی مدد سے لسانی تعصب سے پاک ایک ایسے انسانی قبیلہ کی تخلیق کی تحریک کی جو لفظوں کی بجائے صرف اشاروں کو ابلاغ کا وسیلہ بنائے۔'' ۳۶ غلام محمد نے افسانے 'ترک وفا'' میں زبان کے مسئلے پر ہونے والی قتل و غارت پر اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ افسانے کا ایک کردار اس مسئلے پر ہونے والی خونریزی کے سبب کتوں کو انسانوں پر ترجیح دیتا ہے کہ ان کی زبان ہوتی ہے اور نہ ہی زبان کے مسئلے پر ان کے درمیان جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

> ''موچی نے کہا'' کتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس زبان نہیں ہوتی ہے۔''
>
> نوجوان نے دہرایا۔ ''زبان نہیں ہوتی ہے۔''
>
> ''یوں ـــــ'' موچی نے کہا۔ انھوں نے زبان کے مسئلے پر کبھی خون خرابہ نہیں کیا۔ وہی اچھے رہے ـــــ زبان کے نام پر جو نفرتیں ہوتی ہیں اور جو خون ریزیاں ہوتی ہیں ان میں

کتے نہایت اچھے پائے گئے اور آدمی ان میں ملوث ہوئے۔'' ۳۷ے

اگر زبان کے مسئلے کے حوالے سے اردو افسانوں کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے حوالے سے زبان کا مسئلہ جس قدر اہمیت کا حامل تھا، اردو افسانوں میں اسے اس قدر جگہ نہ مل سکی۔ ملکی یکجہتی کے حوالے سے قومی زبان کی اہمیت یا علاقائی حوالے سے بنگلہ کی ضرورت واہمیت اور بنگالیوں کے دلوں میں بنگلہ کے لیے محبت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے، افسانوں میں اس کا اظہار نہ ہونے کے برابر ہے۔ زبان کا مسئلہ کوئی یک پہلو معاملہ نہ تھا بلکہ یہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی حوالوں سے یہ ایک تہ در تہ مسئلہ تھا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو بعد میں مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا باعث بنا۔ چنانچہ ہمارے خیال میں اس مسئلے پر جس قدر لکھنے کی ضرورت تھی، اسے اس قدر موضوع نہیں بنایا گیا۔

زبان کے مسئلے پر پیدا ہونے والے اختلاف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے اور بنگالی اور غیر بنگالی کی تقسیم کھل کر سامنے آنے لگی۔ مذہب کی بنیاد پر متحد ہونے والے لوگ لسانی، علاقائی اور معاشی مسئلوں کی بنیاد پر تقسیم ہونے لگے۔ زمین کے بیٹے، غیر بنگالیوں کو ناقابل اعتماد خیال کرنے لگے اور ملازمت سمیت تمام معاملات میں بنگالیوں کو غیر بنگالیوں پر ترجیح دی جانے لگی۔ ''یوٹوپیا'' کا ایک کردار اسی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔

> ''اس کی ملازمت کا ذکر آیا تو انھوں نے منہ لٹکاتے ہوئے بڑے معذرت طلب لہجے میں کہا،''ان دنوں ملازمت کی صورتحال بہت خراب ہے اور غیر بنگالیوں کی ملازمت کے سلسلے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ نیو اپوائنٹ منٹ کے سلسلے میں انھیں نہایت سختی کے ساتھ ''سن آف دی سوائل'' کی پالیسی پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' ۳۸ے

اسی افسانے میں آگے چل کر افسانہ نگار نے اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے قیام کے لیے تو ہر طرح کی قربانیاں دی گئیں مگر قیامِ پاکستان کے تھوڑے عرصے بعد ہی لوگوں کے دلوں سے حب الوطنی کا جذبہ ماند پڑ گیا اور اس کی جگہ تعصبات نے لے لی اور لوگ پاکستانی کہلانے کی بجائے بنگالی اور غیر بنگالی کے خانوں میں بٹ کر رہ گئے

> ''صوبائی حکومت کی ملازمتیں مقامی لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مرکزی حکومت کے ماتحت اداروں میں مشرقی پاکستان کے باشندوں کے لیے کوٹا مقرر کر دیا گیا تھا اور ان عہدوں پر صرف ان لوگوں کو لیا جاتا تھا جنھیں مشرقی پاکستان کا اصلی باشندہ ہونے کی سند حاصل تھی۔ پرائیویٹ کمپنیوں میں بھی ملازمت کے سلسلے میں صرف ''فرزندانِ سرزمین'' کو ترجیح دی جانے لگی تھی۔ اب یہاں لوگ مشرقی اور مغربی پاکستانی یا پھر بنگالی اور غیر بنگالی تھے۔ کوئی پاکستانی

نہیں تھا۔''۳۹

سرکاری ملازمت کے حوالے سے لکھتے ہوئے افسانہ نگاروں کو اس مسئلے کا یہ پہلو بھی بیان کرنا چاہیے تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد بنگالیوں کو ملازمتوں سے کس طرح دور رکھا گیا۔اعلیٰ سرکاری عہدوں اور خصوصاً فوج میں ان کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔ان حالات میں بنگالیوں کے اندر اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ پاکستان میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ مغربی پاکستان کے ماتحت محض رعایا بن کر رہ گئے ہیں اور حکومت کے بندوبست میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔اسی احساس کے ردِعمل کے طور پر بعدازاں مشرقی پاکستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں بنگالیوں کو ترجیح دی گئی۔مشرقی پاکستان میں ملازمتوں کے سلسلے میں صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے اگر بنگالیوں کے ان جذبات واحساسات کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو بنگالی ادیبوں کو اس بات کا گلہ نہ رہتا کہ ''انھوں (پاکستانی ادیبوں) نے واقعات کو ایک آنکھ سے دیکھا ہے۔دونوں آنکھوں سے نہیں''۔۴۰ یہ فوج سمیت دیگر سرکاری ملازمتوں میں بنگالیوں کو نظرانداز کرنے کا ردِعمل ہی تھا جو بعد میں غیر بنگالیوں کے لیے نفرت کا باعث بنا۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی نفرت کا ایک بڑا سبب معاشی میدان میں ان کی پسماندگی بھی تھی۔انھیں اس بات کا احساس دلایا گیا کہ مشرقی پاکستان کی دولت مغربی پاکستان کے لوگ سمیٹ کر لے جارہے ہیں اور وہ کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔غلام محمد نے افسانے ''تین مسافر'' میں پاکستان کو ایسی ریل سے تشبیہ دی ہے جس کے مسافر ایک دوسرے سے ناراض ہیں اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں ہیں۔انھوں نے مشرقی پاکستان کو اس ریل کے ایک ایسے ڈبے سے تشبیہ دی ہے جس میں مسافروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس کے مالی وپیداواری وسائل بھی سب سے زیادہ ہیں۔اس کے باوجود اس کے مسافر کھانے پینے کو ترس رہے ہیں۔

> ''وہی سب سے بڑا ڈبہ تھا۔اسی میں کھانے پینے کے سامان موجود تھے مگر اسی ڈبے کے لوگ ایک ایک دانہ چاول اور ایک ایک قطرہ پانی کے لیے تراہ رہے تھے۔اس ڈبے میں مسافروں کی تعداد حالانکہ تمام ڈبوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔لوگ چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور دروازوں پر جھولتے تھے اور ایک مسافر دوسرے پر پل پڑتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے خون خرابہ ہوتا تھا مگر کبھی نہ انجن کے ڈرائیور نے ان کا خیال کیا اور نہ کبھی گارڈ نے ان کی خستہ حالی پر توجہ دی۔''۴۱

لسانی، معاشی اور دیگر کئی ایک مسائل کی بنا پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی یکجہتی میں دراڑیں تو پہلے پڑ چکی تھیں مگر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔اس وقت تک مشرقی پاکستان میں عسکری طاقت کی کمی

کا یہ جواز پیش کیا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا مگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اہلِ بنگال میں اس وقت شدید عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا جب مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے کٹ کر رہ گیا۔اس جنگ کے بعد بنگالی بڑی شدت کے ساتھ یہ سوچنے لگے کہ جب مشکل وقت میں انھیں مغربی پاکستان کی طرف سے تحفظ کا احساس نہیں دلایا جاسکا تو پھر انھیں مغربی پاکستان کے ساتھ متحد رہنے کی کیا ضرورت ہے۔افسانے ''بانگلہ دیش'' میں ایک مقام پر بنگالیوں کے ان جذبات کا اظہار اس انداز میں کیا گیا ہے۔

> ''فاضل مقرر کا یہ خیال ۱۹۶۵ء کی جنگ تک تو صحیح کہا جاسکتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان اسلام کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں مگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور وہ نازک رشتہ ہے، پی آئی اے کا راستہ۔جس دن مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان پی آئی اے کا رشتہ ٹوٹ جائے گا، بس اسی دن سے خلیج بنگال مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان خلیجِ اختلاف بن جائے گی۔''۴۲

یہ ایک حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بہت سے حوالوں سے مشرقی پاکستان کو پس ماندہ رکھا گیا۔لسانی، معاشی اور دفاعی حوالوں سے کیے گئے غلط فیصلوں نے بنگالیوں کے اندر احساسِ محرومی کو جنم دیا اور وہ مغربی پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ہر وہ شخص غیر بنگالی تھا، اہلِ بنگال کے نزدیک مغربی پاکستان کی علامت تھا اور ان کے انتقام کا نشانہ تھا۔انتظار حسین کے ایک افسانے کا کردار، بنگالیوں کے اس رویے کو مغربی پاکستانیوں کے سلوک کا ردِعمل قرار دیتا ہے۔

> ''پھر اسے غصہ آتا چلا گیا''لوگوں کو انھوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے کر مارا۔۔۔بوڑھوں کو، بچوں کو، عورتوں کو۔۔۔وحشی۔۔۔درندے۔۔۔میرا بس چلے تو میں انہیں۔۔۔''اس نے دانت کچکچائے۔
>
> ''انھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔''زیدی نے اعلان کیا۔
>
> ''یہی کرنا چاہیے تھا؟''اسلم غصہ سے بولا۔
>
> ''ہاں ہم پچیس سال تک ان کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے، اس کے بعد انھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔''۴۳

ان حالات میں جب بنگالیوں کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کی تمام محرومیاں دور کرنے کا عندیہ دیا اور کھلے عام مغربی پاکستان کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا تو اہل بنگال کی ایک تعداد ان کی راہنمائی میں اپنے حقوق کے حصول

کے لیے متحد ہوگئی اور وہ اسے اپنا نجات دہندہ خیال کرنے لگے۔ ''بانگلہ دیش'' کا نذرل بھی انھیں جذبات کا حامل نظر آتا ہے جو بنگالیوں کی ایک خاص تعداد کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

''مغربی پاکستان میں یکے بعد دیگرے شخصی آمرانہ حکومتیں اور بڑے سیٹھوں کی لوٹ مار سے ساٹ کروڑ بنگالی سمٹتے سکڑتے صرف ایک جسم میں ڈھلتے گئے اور اس جسم کا چونکا دینے والا نام تھا، شیخ مجیب الرحمٰن۔'' ۴۴

یہاں افسانہ نگار کی اس بات سے ضرور اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان کی کل آبادی یا غالب اکثریت کا نمائندہ قرار دینا صحیح نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۷۱ء کی اس تحریک میں تمام بنگالی شامل نہیں تھے بلکہ مسعود مفتی کے بقول ''جب ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ فال ہوا ہے، میری ذاتی رائے کے مطابق اس وقت بھی ۷۵ فی صد بنگالی پاکستان کے ساتھ تھے۔'' ۴۵ اس بات سے قطع نظر کہ کتنے فی صد بنگالی پاکستان کے ساتھ تھے اور کتنے فی صد علاحدگی پسند تھے، شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان کی کل آبادی کا ترجمان کہنا درست نہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے ضمن میں لکھا گیا ادب، نہ صرف اپنی ادبی حیثیت میں اہم ہے بلکہ یہ ادب ایک خاص تاریخی حیثیت کا بھی حامل ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے افسانہ نگار کو ان تاریخی باریکیوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

مشرقی پاکستان کے حالات ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ علاحدگی سے پہلے ڈھاکہ سمیت مشرقی پاکستان کے اہم شہر ہنگاموں، لوٹ مار اور قتل وغارت کا بری طرح شکار ہو چکے تھے۔ مغربی پاکستانی حکمرانوں نے طاقت کے بل بوتے پر اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کی مگر حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔ ''یوٹوپیا'' میں ان حالات کی عکاسی اس انداز میں کی گئی ہے۔

''ان کے ڈھاکہ آنے کے بعد سے سیاسی جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ دس سال کے زبردست حبس کی وجہ سے ہوا کا دباؤ بے حد بڑھ گیا تھا اور ہوا کے اس دباؤ نے آخر کار ایک زبردست طوفان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ عوامی بیداری اور طلبا کی تحریکوں نے پورے صوبے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اس بے چینی اور انتشار نے عام بغاوت کی صورت اختیار کرلی تھی۔'' ۴۶

انھیں حالات میں ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کا دن آیا تو اس سال کا یوم پاکستان بنگال میں ایک نئے اور مختلف انداز میں منایا گیا۔ یہ دن مجیب الرحمٰن کے حکم پر مشرقی پاکستان میں یومِ مزاحمت کے طور پر منایا گیا۔ برطانوی ہائی کمشنر اور روسی کونسلر سمیت سیکرٹریٹ اور دیگر عمارتوں پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا گیا اور شہر میں مسلح جلوس نکالے گئے۔ مسعود مفتی افسانہ ''باغی'' میں ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کے حالات کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اور پھر ۲۳ مارچ کا پاکستان ڈے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابھرا۔ سرحدی شہر کے بازاروں اور فٹ پاتھوں پر دھڑا دھڑ بنگلہ دیش کے جھنڈے بکنے لگے۔ جسے دیکھو پیسے مٹھی میں دبائے بازار کو بھاگا جارہا ہے ۔۔۔ اور پھر خراماں خراماں سیڑھیاں منڈیر کود کر چھتوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے لگا رہا ہوتا بلکہ بعض لوگ تو مکان کے ہر کونے، ہر منڈیر اور ہر برجی پر علیحدہ علیحدہ جھنڈا لگاتے تا کہ ہر طرف سے نظر آئے۔'' ۴۷

مارچ کے تیسرے ہفتے میں ڈھاکہ کے اندر غیر بنگالیوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا گیا، ان کی عورتوں کی عزتیں لوٹی گئیں اور ان کے گھروں کو جلا دیا گیا۔ لاقانونیت جب تمام حدود پھلانگ چکی تو ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کاروائی کے ذریعے امن وامان قائم کرنے کی ایک کوشش کی گئی۔ اس حوالے سے سقوطِ مشرقی پاکستان کی تاریخ میں ۲۵ مارچ کا دن خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس فوجی کاروائی کے ذریعے امن وامان کی بحالی اور علاحدگی پسند عناصر کے خاتمے کی کوششیں کی گئیں مگر بدقسمتی سے اس فوجی کاروائی کے نتیجے میں کئی بے گناہ بنگالی بھی نشانہ بنے۔ مسعود مفتی اپنے افسانے ''سپنا'' میں فوجی کاروائی کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پھر ۲۵ مارچ آ گیا۔ رات کو پاکستانی فوج نے ایکشن شروع کیا اور بعد ازاں کئی دن تک پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں اس کا خاوند بھی پکڑا گیا۔

''پھر''؟ مفیظ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پھر پیشتر اس کے کہ اسے پتہ چلتا کہ اس کا خاوند پکڑا گیا ہے اسے دوسرے مشتبہ لوگوں کے ساتھ گولی ماردی گئی''۔

''مگر تم تو کہتے ہو کہ وہ مسلم لیگی اور پاکستانی تھا'' مفیظ نے حیرت سے پوچھا۔

''تھا تو ۔۔۔ مگر تم جانتے ہو ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ غلطی سے یا غلط فہمی سے یا غلط مخبری سے کئی بے گناہ لوگ مارے گئے تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو پاکستان کے حامی تھے۔'' ۴۸

اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے حامی ایک عجیب کشمکش کا شکار ہو چکے تھے۔ اگر وہ بطور پاکستانی حب الوطنی کی بات کرتے تو علاحدگی پسند عناصر ان کی جان لینے کو تیار تھے اور اگر وہ بنگالی قومیت کی بات کرتے تو پاکستانی فوجیوں کے ہاتھوں مارے جانے کا ڈر تھا۔ ایک عام آدمی جو محض امن وسکون کی زندگی کا خواہش مند تھا، اس زمانے کے مشرقی پاکستان میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مسعود مفتی کا افسانہ ''نیند'' اس صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک مغربی پاکستانی ہے جس کے گھر کے باہر علاحدگی پسند نوجوان ''جے بنگلہ اور مجیب زندہ باد'' کے نعرے لگا کر اس کا سونا حرام کر دیتے ہیں۔ آخر کار وہ ان کے نعروں سے تنگ آ کر ان کے ساتھ

جے بنگلہ کا نعرہ لگاتا ہے تو اسے ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مگر وہ پچیس مارچ کی رات تھی۔فوج باغیوں کی تلاش میں تھی۔ان کی مدافعت کے مرکزوں پر حملے کر رہی تھی اور شہر میں تابڑ توڑ گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔۔۔اور وہ پانچ راتوں کے بعد سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

رات کے پچھلے حصے میں پھر دستک ہوئی۔۔۔اس نے اندر سے زور سے نعرہ لگایا۔

''جے بنگلہ''

باہر فوجیوں کی پارٹی میں سب کے ابرو سمٹ گئے۔

پھر دستک۔۔۔

''جے بنگلہ''

اب انچارج نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور پکارا

''دروازہ کھولو''

وہ آدھی نیند میں ڈوبا ہوا کچھ اندازہ نہ کر سکا۔

''نہیں کھولتا۔۔۔۔۔جے بنگلہ۔۔۔۔۔جے بنگلہ''

انچارج نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔اس نے سٹین گن سے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور بندوق کی نالی اندر کر کے بھرپور فائر کھولا۔

وہ لمحہ بھر کو چارپائی پر اچھلا۔۔۔تڑپا۔۔۔اور پھر دائمی نیند سو گیا۔''[۴۹]

اس فوجی کاروائی کے دوران پاکستانی فوج اپنی طاقت کے بل بوتے پر وقتی طور پر امن وامان قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی مگر بعض مقامات پر فوجی جوانوں سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوگئیں جن کے سبب بنگالیوں کے دلوں کی نفرت میں اضافہ ہوا اور پاکستانی فوج ایک غاصب اور ظالم فوج کے روپ میں سامنے آئی۔اس عرصے میں پاکستانی فوجیوں پر خصوصاً جنسی زیادتیوں کے الزامات سامنے آئے۔اس بات سے قطع نظر کہ تعداد کے اعتبار سے اس نوع کے واقعات میں کس قدر صداقت تھی، یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات پر پاکستانی فوجی اس طرح کی بداخلاقیوں میں ملوث پائے گئے۔مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنی اپنی سچائیاں'' سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کے اس پہلو سے ابھرنے والے حالات کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''رات کو توپوں کی گھن گرج میں وہ آئے اور کہنے لگے اپنے مرد ہمارے حوالے کر دو۔سارے مرد ہمارے ساتھ آ جائیں۔میں نے کہا یہ میرا بیٹا تو مرد نہیں ہے۔بچہ ہے۔مگر انھوں نے

میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میری بات نہیں سمجھے، جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔

''تم بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''میں یہاں سے کہاں جاسکتی ہوں! مگر تم لوگ یہ تو دیکھو۔۔۔''

''ہم سب دیکھ لیں گے'' انھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔''

میں سامنے سے ہٹ جانے کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر جب وہ میری بیٹی کی طرف بڑھے تو میں ان کا مطلب سمجھ گئی اور آگے بڑھی ''یہ تو میری بیٹی ہے، یہ تمھاری بیٹی ہے، یہ تو مرد نہیں ہے۔''

بیٹی؟ کس کی بیٹی؟ ان کی آنکھیں سادہ کاغذ کی طرح بالکل سفید تھیں۔

اور پھر زمین کی کوکھ ننگی ہوگئی۔ میری بیٹی اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے ننگی ہوگئی۔ انھوں نے اس کی ساڑھی پکڑ کر کھینچی اور وہ ساڑھی لمبی ہونے کے بجائے ان کے ہاتھوں میں لپٹ گئی۔''۵۰؎

اسی طرح احمد سعدی کا افسانہ ''مٹی کی خوشبو'' بھی باغیوں کے متلاشی ان سرحدی پہرے داروں کی کہانی ہے جو ایک گھر میں داخل ہو کر باغیوں کے بارے میں معلوم کرتے ہیں مگر جب ان کی نظر ایک نوجوان لڑکی پر پڑتی ہے تو ان کی نیت بدل جاتی ہے۔۵۱؎

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کا آپریشن جن مقاصد کے حصول کے لیے کیا گیا تھا وہ وقتی طور پر تو حاصل کر لیے گئے۔ شر پسندوں کی بڑی تعداد یا تو بھارت فرار ہوگئی یا زیرِ زمین چلی گئی اور کچھ لوگوں کو پکڑ لیا گیا مگر یہ اثرات دیرپا ثابت نہ ہوئے اور تھوڑے عرصے بعد یہ لوگ دوبارہ سر اٹھانے لگے۔ اس کا ایک سبب حکومت کا بے وقت عام معافی کا اعلان تھا جس کے نتیجے میں بھارت فرار ہو جانے والے شر پسند عناصر وہاں سے تربیت حاصل کر کے واپس آگئے اور پھر اپنی کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ مسعود مفتی اپنے افسانے ''خوش قسمتی'' میں اس صورت حال کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

''وہ طنز سے ہنسی'' عام معافی کا اعلان جو ہوگیا ہے۔''

''مگر یہ تو اچھا قدم ہے۔ میں تو بہت خوش ہوا تھا یہ اعلان سن کر''

''اچھا قدم تو ہے لیکن اچھی چیز اگر غلط وقت پر غلط انداز میں کی جائے تو نتیجہ اچھا نہیں ہوتا''

کیا غلطی ہے؟ میری تو سمجھ میں نہیں آتی''

اگر آپ لوگ ان باتوں کو سمجھ سکتے تو ہم لوگ اپنے گھروں میں کیوں بند ہو جاتے''

''پھر بھی، کیا خرابی ہے اس اعلان میں''

''یہ اعلان دو تین ماہ پہلے نہیں آ سکتا تھا کہ سبھی لوگ واپس آ جاتے؟ اب جو وہاں مجبوری سے رہے تو وہ ہندوستان سے گوریلوں کی تربیت لیتے رہے۔ اب یہ ٹریننگ مکمل ہوئی ہے تو آپ نے عام معافی دے کر سرحدیں کھول دیں، دھڑا دھڑ آئیں گے ان کے تربیت یافتہ گوریلے اب۔'' ۵۲

ان علاحدگی پسندوں کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد تخریب کاری کا دوبارہ آغاز ہوگیا۔ ڈھاکہ اور اس کے گرد و نواح میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور لوٹ مار شروع ہوگئی۔ غلام محمد نے افسانے'' بکرم پور ہاؤس'' میں اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب انسانوں نے وحشی پن میں جانوروں کو بھی مات کر دیا تھا۔ ۵۳ مسعود مفتی نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے افسانوں میں اس دور کی عکاسی کی، وہ افسانے'' جال'' میں ڈھاکہ کے ان دنوں کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہر شخص کی زندگی کا اگلا پل تقدیر کے گنجلک میں چھپا ہوا تھا۔ اکثر لوگ ضروری کام کاج کے علاوہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ سرِ شام ہی سڑکیں سنسان ہونے لگتی تھیں۔ رات پڑتے ہی ہو کا عالم چھا جاتا تھا اور پھر چوراہوں پر ٹریفک کانسٹیبل کی بجائے خوف اور ہراس کے سائے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلانے لگتے تھے۔ جس طرح ہسپتال کی فضا میں مخصوص بُو رچی ہوتی ہے اسی طرح ڈھاکہ کی فضا میں ڈر، بے یقینی، درماندگی، بے دلی اور ویرانی کا ملا جلا طلسم چھایا ہوتا تھا۔'' ۵۴

اسی افسانے میں وہ آگے چل کر ڈھاکہ کے خارجی حالات کے انسانی ذہنوں پر پڑنے والے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میں تو یہ کہوں گا کہ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سے مشرقی پاکستان کی ساری فضا ہی ایسی ہوگئی تھی جس میں صرف وہم پلتا تھا۔ جہاں آدمی کو بالکل پتہ نہ ہو کہ کس وقت کس طرف سے اس پر حملہ ہو جائے گا اور کون آدمی کس انداز میں اسے دھوکہ دے گا۔ وہاں وہم نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔۔۔ ایک طرف خارجی حالات اور دوسری طرف داخلی ذہنی کیفیت۔ یہ دونوں مل کر ایسا پیچیدہ جال بن دیتے تھے جس سے نکلنے کے لیے انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہی رہتا ہے۔۔۔ مگر نکل نہیں سکتا۔'' ۵۵

مسعود مفتی نے سقوطِ ڈھاکہ کے المیے کا مختلف پہلوؤں سے مشاہدہ کیا اور اس سانحے کے ان پہلوؤں کو مختلف

اصناف کے ذریعے بیان کیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے ان افسانوں میں بعض مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار کوئی افسانہ نہیں لکھ رہا بلکہ حقیقی واقعہ تحریر کر رہا ہے۔ اس وجہ سے بعض اوقات افسانے سے افسانویت اور تخلیقی عنصر کم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس دور کے افسانوں میں خبریت کا عنصر آنا اس لیے بھی ناگزیر ہو گیا تھا کہ اس سانحے کے دوران شخصی حکومت کے تابع ذرائع ابلاغ نے عوام کو بے خبر رکھنے کی کوشش کی۔''[۵۶] شاید افسانہ نگاروں نے بعض مقامات پر اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تخلیق پر حقیقت کو ترجیح دی۔ فتح محمد ملک مسعود مفتی کے افسانوں کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''چونکہ مسعود مفتی کا مسلک فنی حقیقت نگاری ہے۔ اس لیے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر ان کے افسانوں کے تازہ مجموعہ ''ریزے'' میں زوال کی لپیٹ میں آئی ہوئی بستی کا نام ڈھاکہ ہے۔ اس میدان کا نام پلٹن میدان ہے اور یہ منظر ہتھیار پھینکنے کا منظر ہے اور جس پہلے، دوسرے اور تیسرے آدمی کے منہ پر تھوکا گیا ہے وہ میں، آپ اور ہم سب ہیں۔''[۵۷]

سانحۂ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھنے والوں میں انتظار حسین ایک ایسا نام ہے جو نہایت خوب صورت افسانوی انداز میں سارے حالات کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین نے ''شہرِ افسوس'' میں ڈھاکہ کو شہرِ خرابی کا نام دیا ہے کہ جس میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں، سانس لیتے لوگوں کی موجودگی کے باوجود کہیں زندگی کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے نہایت مؤثر افسانوی انداز میں ڈھاکہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> ''اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جا نکلا۔ لاشیں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ جیتا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند، رستے سنسان، گلیاں ویران۔ کسی کسی مکان کے بالائی دریچے کے پٹ اتنے کھلتے کہ دو سہمی سہمی آنکھیں نظر آتیں اور پھر جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔ عقل حیران تھی کہ کیسا نگر ہے۔ لوگ گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔''[۵۸]

ام عمارہ اپنے افسانے ''کس نے کس کو اپنایا'' میں وحشت و بربریت کے اس دور کا تذکرہ کرتی ہیں جب انسان، دوسرے بے گناہ انسانوں کا خون بہانے پر تلا ہوا تھا۔ بے بس انسان خدا سے مدد طلب کر رہے تھے مگر ان حالات میں دعائیں بھی بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ افسانہ نگار کے بہ قول ''بے کسی اور بے بسی جو اس نے دیکھی اور برتی اس میں خدا کی حیثیت بالکل تماش بینوں کی سی تھی۔''[۵۹] ام عمارہ انسانیت سے عاری اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''انسان انسان کا خون پی رہا تھا اور اس کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی ۔اس اتنی بڑی وسیع اور مہذب دنیا میں کوئی ایسا نہیں نظر آتا تھا جو ان خون چوسنے والے سانپوں کو بتا دیتا کہ آدمی پر آدمی کا خون حرام ہے اور یہ گناہِ کبیرہ ہے لیکن گناہ کیا ہے اور حرام کس کو کہتے ہیں اس کے بارے میں سوچنے اور دھیان دینے کے لیے نہ کسی کے پاس وقت تھا اور نہ فرصت ۔'' [۶۰]

ہمارے افسانہ نگاروں نے ان فسادات کو نہ صرف واقعاتی سطح پر دیکھا اور بیان کیا بلکہ انھوں نے ان فسادات کو وسیع تر معاشرتی تناظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔ممتاز شیریں کے بقول ''فسادات کو ایک وسیع سیاسی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکے اور پوری قوم کا تجربہ سمویا جا سکے تو پایہ کی تخلیق ممکن ہے۔''[۶۱] افسانہ نگار نے نہ صرف فسادات کی ظاہری سطح کو دیکھا اور بیان کیا بلکہ انھوں نے فسادات میں شامل انسانوں کا گہرا داخلی تجزیہ بھی ان افسانوں میں پیش کیا ہے۔

فسادات کے ان دنوں یوں تو آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی مگر آزادی کی اس جنگ میں لوگ اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کا بھی کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ان کی یہ خواہشات مادی اشیا اور مال و دولت کا حصول بھی تھا اور جنسی خواہشات کی تکمیل بھی۔ابراہیم جلیس افسانے ''بانگلہ دیش'' میں اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ادھر مشرقی پاکستان میں جہاں مغربی پاکستان سے علیحدگی کی تحریک چل پڑی وہاں موقع پرست غنڈوں نے بھی ہر اردو بولنے والے کو مغربی پاکستان کا ایجنٹ صرف اس لیے بنایا کہ اسے قتل کرنے سے اس کا بھرا ابھرایا گھر، اس کی جوان بیٹی یا بیوی کا جسم، اس کی دکان، اس کا آفس اور اس کا کاروبار مفت مل سکتا تھا۔'' [۶۲]

۱۹۷۱ء کے آخری مہینوں میں مشرقی پاکستان میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا، ہر طرف علاحدگی پسند عناصر دندناتے پھر رہے تھے اور عملی طور پر مشرقی پاکستان پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود بنگالیوں کی ایک خاص تعداد ایسی بھی موجود تھی جو پاکستان کی سالمیت کی خواہش مند تھی اور اس کو متحد رکھنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھی۔مسعود مفتی کے بقول یہ لوگ اکثریت میں تھے مگر ان کی خاموش اکثریت پر پُرجوش اقلیت غالب آچکی تھی [۶۳] وہ افسانے ''خوش قسمتی'' میں اس خاموش اکثریت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس پس منظر میں ہم ان بنگالیوں کی ہمت اور حب الوطنی کی داد دے رہے تھے جو اب بھی ٹیلی ویژن پر آ کر پاکستان کی حمایت میں تقریریں کر رہے تھے اور دوسرے پروگرام پیش کر رہے تھے ۔۔۔۔مگر جو لوگ اب بھی اپنی جان اور مستقبل کا خطرہ مول لے کر ٹیلی ویژن

پر آرہے تھے ان کی حب الوطنی اور بہادری میں کوئی کلام نہ تھا۔''۶۴

سقوطِ مشرقی پاکستان کے حالات کے تسلسل میں بھارت اور پاکستان کی جنگ ایک اہم پہلو ہے مگر اس حوالے سے افسانوں میں ذکر نہیں ملتا البتہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے سانحہ کا حوالہ کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد نے افسانے ''پل'' میں متحدہ پاکستان کو ایک پل سے تشبیہ دی ہے جو نہایت خستہ حال ہو چکا ہے اور کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔ مگر اس کی انتظامیہ اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے تصوراتی منصوبوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پل کے آدھے لوگ اپنے حصے کا پل الگ کر لیتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد ۱۶ دسمبر کے سانحے کا علامتی انداز میں ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''اچانک ایک دن خبر آئی کہ پل کے آدھے لوگوں نے ایک زبردست دروازہ لگا کر آدھے پل کو بالکل الگ کر لیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ باقی پل کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ جن لوگوں کو پل کے دوسرے حصے کا ہمدرد سمجھتے ہیں بلا تامل مار ڈالتے ہیں۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے بیرونی امداد بھی حاصل کر لی ہے اور ان کے ساتھیوں نے سارے پل کی ناکہ بندی کر لی ہے۔''۶۵

انتظار حسین نے اپنے افسانے ''شہرِ افسوس'' میں اس دن منعقد کی جانے والی اس تقریب کا ذکر اپنے خاص انداز میں کیا ہے، جس میں پاکستانی جنرل نے ہتھیار ڈالے اور دستاویز پر دستخط کیے۔

''میں ایک عجیب میدان میں جا نکلا جہاں خلقت امنڈی ہوئی تھی اور فتح کا نقارہ بجتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ لوگو یہ کون سی گھڑی ہے اور یہ کیا مقام ہے۔ ایک شخص نے قریب آکر کان میں کہا کہ یہ زوال کی گھڑی ہے اور یہ مقام عبرت کا ہے۔''

''اور یہ کون شخص ہے کہ جس کے منہ پر تھوکا گیا ہے''

اس شخص نے زہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا ''تو اسے نہیں پہچانتا''

''نہیں''

''اے بدشکل آدمی، یہ تو ہے۔''

''میں؟'' میں سناٹے میں آ گیا۔

''ہاں تو''

میں نے اسے غور سے دیکھا اور میری پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ تو سچ مچ میں تھا۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو پہچانا اور میں مر گیا۔''۶۶

ہتھیار ڈالنے کی خبر جب مغربی پاکستان میں موجود اس ماں تک پہنچتی ہے جس کے بچے فوج میں شامل ہوکر مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنگ لڑ رہے تھے تو اس کے جذبات کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ اس ماں کے جذبات دراصل ہر محب وطن پاکستانی کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

''جب ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی تو عائشہ بُت بنی رہ گئی اسے ایسے لگا کہ جو گردن وہ اب تک اٹھائے کھڑے تھی وہ ٹوٹ گئی۔ درد کی لہر اس کی نس نس میں تیرنے لگی۔ اس نے سارا دن کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ اسے اپنے وجود کی بوجھل گٹھڑی پھینک دینے کو جی چاہا۔ وجود کا کتنا بوجھ ہے یہ پہلی بار احساس ہوا۔ اس نے ان گنت تاروں کو بے بسی سے دیکھ کر سوچا کہ انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا سچ مچ ان ستاروں کا کھیل ہے۔'' ۶۷

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کے پیچھے بے شمار عوامل کارفرما تھے۔ اس شکست کو کبھی فوجی شکست کا نام دیا جاتا ہے تو کبھی سیاسی۔ بعض افراد کے نزدیک یہ شکست ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی۔ رشید امجد کے افسانے ''کہانی ایک زوال کی'' کا ایک کردار خود کلامی کرتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''میں گلی کے نکڑ پر کھڑے تاریکی میں ڈوبے ہوئے شہر کو تلاش کرتا ہوں۔ دھیرے دھیرے شہر کالی جھیل میں ڈوب رہا ہے۔ میں اندھیرے میں چھپے ان سانپوں کو تلاش کرتا ہوں۔ وہ میرے آس پاس موجود ہیں۔ میری تاریخ کے صفحوں کے گھونسلوں میں سے باہر نکلتے ہیں۔۔۔ اے سانپو۔۔۔ اے سانپو۔۔۔ میری تاریخ۔۔۔ اے مسجدوں کے شہر زندہ باد۔۔۔ تو دلدل میں ڈوب رہا ہے۔ لیکن میں نے اپنی بندوق دانستہ نہیں پھینکی۔۔۔ مجھے دھوکہ دیا گیا ہے۔'' ۶۸

صفیہ عباد اس افسانے کے متعلق کہتی ہیں کہ ''یہ کہانی اپنے عہد کے سیاسی زوال، سیاسی بدامنی، بے چینی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ایک نوحہ ہے اپنے مٹنے کا، اپنے کلچر اور تہذیب کی تباہی کا، اپنی تاریخ کی بربادی ہے۔'' ۶۹

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد پاکستانی فوجیوں سمیت دیگر مغربی پاکستانی افسران ہندوستان کے قیدی بن کر رہ گئے۔ ان قیدیوں میں ممتاز ادیب مسعود مفتی بھی شامل تھے۔ انھوں نے بھارت کے جنگی کیمپوں میں وہاں کے حالات وواقعات کا براہ راست مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو افسانوں کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کیا۔ ان کیمپوں میں قید ہونے والوں پر کیا گزری، قید کے اس عرصے میں ان کی جذباتی کیفیات کی عکاسی مسعود مفتی کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ ''نیند'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں جنگی قیدیوں کے ساتھ بھارتی حکومت کے رویوں کے ساتھ ساتھ ان قیدیوں کے جذبات واحساسات کی بھی خوب صورت عکاسی کی گئی

ہے۔

''انھوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں گولیاں چلا کر انہیں قتل کرنا شروع کیا تا کہ ان کے خاندانوں میں بے چینی بڑھے اور وہ حکومت پاکستان پر زور ڈالیں کہ وہ ہندوستان کی سب شرائط مان کر جنگی قیدیوں کو رہا کرائے۔ یوں لگتا تھا کہ اس مہم میں آج ہماری باری آگئی ہے۔ جہاں سے کسی نے دن دہاڑے بھاگنے کی کوشش تو نہ کی تھی مگر ہندوستان نے یہی بہانہ بنا کر گولی چلا دی تھی۔''۷۰

بھارتی حکومت نے بیمار اور زخمی قیدیوں کو حکومت پاکستان کے حوالے کرنے کا اعلان کیا مگر بیمار اور زخمی قیدیوں کو رہا کرنے کی بجائے صحت مند قیدیوں کو رہا کیا گیا تا کہ دنیا کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ ہندوستانی حکومت نے قیدیوں کے ساتھ کس قدر اچھا سلوک روا رکھا ہے۔

مسعود مفتی کا افسانہ ''کفارہ'' بھی ایک جنگی قیدی کے جذبات و احساسات پر مبنی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ہندوستانی لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ خود پر فخر کرے یا شرمندگی محسوس کرے۔ مسعود مفتی نے اس افسانے میں ایک جنگی قیدی کی باطنی کیفیات کا مؤثر اظہار کیا ہے۔

''وہ جنگی قیدی تھا اور سب لوگ اسے تماشے کی طرح دیکھ رہے تھے اس سے اسے خفت بھی ہو رہی تھی مگر ساتھ ہی وہ کبھی کبھی تن بھی جاتا کہ میں ملک کی خاطر گرفتار ہوا ہوں، خفت کیسی، یہ تو فخر کی بات ہے مگر اگلے لمحے اسے خیال آتا کہ ہوں تو شکست خوردہ، اور اسے اپنے پر ندامت ہونے لگتی۔ کبھی خفت، کبھی فخر اور کبھی ندامت کے متضاد جذبوں میں لوٹ پوٹ ہوتا وہ لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کرتا رہا۔''۷۱

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعے کے بعد ہندوستانی اور مغربی میڈیا نے پاکستانی فوجیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ خاص کر جنسی حوالے سے ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ میڈیا میں پیش کیے گئے اعداد و شمار کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے مغربی پاکستانی فوج محض عورتوں کی عزتیں لوٹنے میں مصروف تھی۔ یہ پروپیگنڈا کلی طور پر حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ اس نوعیت کے کچھ واقعات ضرور رونما ہوئے تھے مگر انھیں اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا کہ حقیقت افواہوں تلے دب کر رہ گئی۔ مشرف احمد کے افسانے ''سرحدیں'' میں ایک شکست خوردہ پاکستانی فوجی کے انھی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

''اس نے رنگ پور کے محاذ پر ہتھیار ڈالے تھے۔ جہاں وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ طویل عرصے تک موت کے سائے میں اپنے آدرش کی حفاظت اور بقا کے لیے جنگ کرتے رہے

تھے۔ بعد میں ان کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیاں کی جاتی رہی ہیں لیکن اس کے نزدیک ان باتوں کی کوئی حقیقت نہ تھی جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ فوجیوں کی زندگی سے ناواقف ہیں۔ بھلا موت کے سائے میں خندقوں میں زندگی گزارتے ہوئے بارود کے دھوئیں کی چادر میں لپٹے ہوئے، انسانی جسم کی مہک اپنی جانب کیسے متوجہ کر سکتی ہے۔ محاذ جنگ پر زلفوں کی خوشبو، بارود کے دھوئیں سے نہیں جیت سکتی اور نہ گولیوں کے شعلوں کے آگے جسموں کی چاندی کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔''۲؎

مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد جہاں اس سانحے کا ایک پہلو جنگی قیدیوں کے جذبات واحساسات پر مشتمل تھا تو دوسرا پہلو ان لوگوں کی حالت زار تھی جو کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ احمد سعدی کے افسانے ''سمجھوتہ'' کا ایک کردار اپنے دکھوں کی کہانی سناتے ہوئے ان لوگوں کے مصائب کی عکاسی کرتا ہے۔

''علی احمد کے استفسار پر اکبری نے بتایا کہ وہ دیناج پور میں رہتی تھی۔ اس کے والد کی کپڑے کی دکان تھی۔ دو بڑے بھائی تھے، وہ بھی والد کے ساتھ ہی کاروبار میں لگے ہوئے تھے۔ ایک سال قبل اس کی شادی ہوئی تھی اور اس کا شوہر ڈھاکہ میں ملازم تھا۔ ہنگامہ کے دوران اس کے والدین اور بڑے بھائی قتل کر دیے گئے اور وہ دونوں بہنیں کسی طرح گھر سے نکل کر ایک بنگالی کے گھرانے میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس طرح ان دونوں کی جانیں بچ گئیں لیکن اس کے شوہر کا اب تک کوئی پتا نہ تھا کہ وہ بھی قتل کر دیا گیا ہے۔''۳؎

اسی طرح مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد وہاں کے حالات کی عکاسی مسعود مفتی کے بعض افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔

''بنگلہ دیش کو آزاد ہوئے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ بہاریوں اور پاکستان کے حامی بنگالیوں کا سارا سامان لوٹا جا چکا تھا مگر شہر کی فضا میں ٹھہراؤ کی بجائے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ ہنگامہ دار و گیر زوروں پر تھا اور ایسے لوگ دھڑا دھڑ گرفتار کیے جا رہے تھے جنھوں نے مبینہ طور پر پاکستانی حکومت اور فوج کے ساتھ تعاون کیا تھا۔۔۔۔ جنگ کے ہیجان کے بعد امن اور آزادی سے سکون نہیں ملا بلکہ غیر یقینی صورت بڑھ گئی تھی۔''۴؎

بنگلہ دیش کے قیام کے لیے بنگالیوں کی جدوجہد کے پیچھے ان کی معاشی بدحالی ایک اہم عنصر تھی۔ امتیاز حسین کے بقول ''بنگلہ دیش کی تخلیقی منطق میں وہی حالات وواقعات ہیں جن کی وجہ سے بنگالی دو وقت کی روٹی کے محتاج تھے اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم تھے۔''۵؎ ان کا خیال تھا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد ان کے دن پھر جائیں گے، وہ

آرام وسکون کی زندگی گزار سکیں گے اور انھیں مالی پریشانیوں سے آزادی مل جائے گی مگر قیامِ بنگلہ دیش سے بھی ان کی یہ آرزوئیں پوری نہ ہوسکیں تو فطری طور پر ان کے اندر مایوسی نے جنم لیا۔ افسانہ ''بانگلہ دیش'' کا نذرل جو مجیب الرحمٰن اور بنگلہ دیش پر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا، قیامِ بنگلہ دیش کے بعد جب مغربی پاکستان آجاتا ہے تو اپنی مایوسی کا اظہار اس انداز میں کرتا ہے۔

> ''میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے اور موضوع بدلنے کے لیے پوچھا'' تیرا بنگلہ دیش کیسا ہے؟''
> نذرل جیسے اپنی زبان اور اپنی آواز طنز کے تیزاب میں ڈبو کر لوٹا تھا۔ بولا ''میرا بنگلہ دیش۔۔۔؟ میرا بنگلہ دیش ابھی کہاں بنا ہے۔ پتہ نہیں ہم غریبوں کا بنگلہ دیش کب بنے گا صاب۔ ابھی تو بڑا بنگلہ والا بنگالیوں کا بنگلہ دیش بنا ہے۔ شیخ مجیب کا بنگلہ دیش۔ نورا میاں چودھری کا بنگلہ دیش۔ نذرل کا بنگلہ دیش کدھر ہے؟''۶؎

ابراہیم جلیس کا افسانہ ''الٹی قبر'' بھی غربت کی چکی میں پستے انھیں لوگوں کا المیہ بیان کرتا ہے کہ جن کے حالات اتنی بڑی تبدیلی کے باوجود بھی ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ وہ مشرقی پاکستان میں بھی غربت کے ہاتھوں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے تو قیامِ بنگلہ دیش کے بعد بھی ان کے حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ غربت کی چکی میں پستے یہ لوگ جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے مغربی پاکستان کا رخ کرتے ہیں تو بھی ان کی سوچوں کا محور زمین کا ایک ایسا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ آرام کی زندگی گزار سکیں جب کہ امیروں کے لیے نہ مشرقی پاکستان میں کوئی مسئلہ تھا نہ مغربی پاکستان میں۔

> ''دیکھو عاشو۔۔۔اولا (اللہ) میاں کا کتنا زمین نیچے خالی پڑا ہے۔ ادھر سالا ہم غریبوں کو ایک کمرہ کھولی بنانے کا زمین بھی نہیں ملتا۔ صرف سالا دو گز زمین قبر کے لیے فری ملتا ہے اور ادھر امیر لوگ کو۔۔۔۔ بنگلہ دیش میں قاضی کبیر کو بڑا بنگلہ تو ادھر پاکستان میں قاضی بشیر کو بڑا بنگلہ۔''۷؎

افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے سانحۂ مشرقی پاکستان سے متاثر ہونے والے لوگوں کی کہانیاں اس انداز میں بیان کی ہیں کہ اس دور اور اس مقام سے دور بیٹھا قاری بھی یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے یہ ساری واردات اس کے قلب و ذہن پر گزری ہے۔ وقار عظیم اردو افسانے کی اس خاصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اردو افسانوں کے ذریعے زندگی کی جو تصویریں ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں ان سے ہمیں زندگی کو اسی طرح دیکھنے، جاننے، پہچاننے اور سمجھنے اور پھر اپنے تجربے میں وسعت اور گرائی پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے جیسے یہ تجربہ کسی اور کا نہیں خود ہمارا ہے۔''۸؎

ہمارے افسانہ نگار جب سقوطِ مشرقی پاکستان جب سقوطِ مشرقی پاکستان کے نتیجے میں برپا ہونے والے واقعات بیان کرتے ہیں تو قاری خود کو تاریخ کے ان واقعات میں شامل تصور کرنے لگتا ہے اور یوں افراد کے انفرادی تجربات، اجتماعی رنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔

سقوطِ مشرقی پاکستان سے مشرقی پاکستان میں موجود لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر متاثر ہوئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کے محب وطن لوگوں کے دلوں پر بھی قیامت گزر گئی تھی یہ لوگ براہ راست متاثرین میں تو شامل نہ تھے مگر بطور پاکستانی ان کے لیے مشرقی پاکستان کی علاحدگی بہت بڑا صدمہ تھا اور لوگوں نے اس کی شدت کو اپنے دلوں میں محسوس کیا۔ اس وقت محبِ وطن پاکستانی شدید مایوسی کا شکار ہوئے تاہم ہمارے افسانوں میں موضوع کے اس پہلو کا تذکرہ نہایت کم ملتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جہاں سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر اور منظر کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا، وہاں ضروری تھا کہ اس سانحے کے مغربی پاکستانیوں کے دلوں پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا جاتا۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر لکھنے والے ادیبوں کا یہ بھی فرض بنتا تھا کہ ملک کی سالمیت اور بقا سے مایوس لوگوں میں امید کی نئی روشنی پیدا کریں۔ انھیں ماضی کو یاد رکھ کر اس سے سبق حاصل کرنے کا درس دیں اور آیندہ اس نوع کے حادثات سے بچنے کا راستہ دکھائیں۔ اردو میں اس طرح کے افسانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے البتہ اے حمید نے افسانہ ''اب جاگتے رہنا ہے'' لکھ کر یہ فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جو اس سانحے سے کچھ دن پہلے کسی کام سے مغربی پاکستان میں آجاتا ہے مگر اسے واپسی کا موقع نہیں ملتا اور مشرقی حصہ الگ ملک کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جب اپنی مایوسی کا اظہار کرتا ہے تو افسانے کا ایک اور کردار اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''اب ہمیں نیند کو مار بھگانا ہے۔ نیند کا دور ختم ہو چکا۔ اب جاگتے رہنا ہے۔ مجھے جاگتے رہنا ہے، تمھیں جاگتے رہنا ہے، ساری قوم کو جاگتے رہنا ہے، قوم کے لیڈروں کو جاگتے رہنا ہے، کسی حالت میں بھی ہمت نہیں ہارنی ہے، کسی عالم میں بھی نیند کو اپنے اوپر طاری نہیں کرنا ہے۔ بازوؤں کی طاقت اور گرمی کو ایک ہی نقطے پر مرکوز کر کے مل جل کر کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر کام کرنا ہے۔ ہمیشہ بلند، مضبوط اور ایماندار خیالات کے ساتھ ساتھ پرواز کرنی ہے۔''۹۷

سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ ایک ہمہ پہلو حادثہ تھا، جہاں یہ واقعہ ہماری قومی تاریخ میں ایک سیاہ باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا وہاں یہ المیہ انسان اور انسانیت کے بھی کئی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتا نظر آتا ہے۔

قومی تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو افسانہ اپنے آغاز سے آج تک اپنے عہد کی تاریخ کو مختلف

پہلوؤں سمیت اپنے دامن میں سمیٹتا چلا آیا ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو افسانے کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اردو افسانہ ہمیشہ ہمیشہ اپنے زمانے کے حالات وواقعات سے ہم آہنگ رہا ہے اور اس نے ہر زمانے میں اپنے ماحول کی نہایت صحیح، سچی اور پُر خلوص ترجمانی کی ہے اور اس کی اسی خصوصیت نے اس میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا ہے۔اس میں ہماری تاریخ کا مدوجزر موجود ہے۔''۸۰

اردو افسانے کی اس خوبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اردو افسانے نے پاکستان کی تاریخ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کیا کردار ادا کیا تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ افسانہ نگاروں نے ان افسانوں میں اس سانحے کے پس منظر اور پیش منظر سمیت اکثر پہلوفن کے پیرائے میں بیان کر دیے ہیں۔قیامِ پاکستان سے سقوطِ مشرقی پاکستان تک کا یہ سفر کس انداز میں طے ہوا،اس میں کس قدر ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا عمل دخل تھا اور بھارت سمیت دیگر عالمی طاقتوں نے دونوں حصوں کی علاحدگی میں کیا کردار ادا کیا۔یہ افسانے ان تمام پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔اس سانحے کے بعد پاکستان کے محبِ وطن لوگ مایوسی اور بے یقینی کا شکار ہوئے تو افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے ان کی ہمت بندھائی اور نئے عزم کے ساتھ جینے اور باہمی انتشار سے بچنے کا درس دیا۔''وطن کا قرض'' کے مرتبین،اس المیے کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''۱۹۷۱ء کے حادثہ نے ایک بار پھر اہلِ قلم کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ان میں سے کچھ خود یا ان کے عزیز مشرقی پاکستان میں تھے اور سیلابِ بلا خیز ان کے سروں سے گزرا اور کچھ وہ تھے جنھوں نے ساحل سے اپنی کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا اور ان کا درد محسوس کیا۔اس دور کے چند افسانوں میں احساسِ زیاں کے ساتھ ساتھ متاعِ باقی ماندہ کی حفاظت کرنے کا عزم بھی کارفرما نظر آتا ہے۔''۸۱

قومی حوالے سے ہٹ کر دیکھا جائے تو پھر بھی یہ حادثہ انسانی المیے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جانے والا حادثہ ہے۔اس سقوط کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے مختلف طبقات جس انداز میں متاثر ہوئے اس کی مثال نہیں ملتی۔قتل وغارت اور خونریزی کے اس دور میں جب انسان تہذیب وتمدن کے تمام تر لبادے اتار کر سامنے آیا تو اس کے کئی روپ دیکھنے کو ملے جو عام حالات میں تہذیب وتمدن کے پردوں میں چھپے رہتے ہیں۔ہمارے افسانہ نگاروں نے آشوب کے ان دنوں میں انسان کی ان مختلف کیفیتوں کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر معین الدین عقیل مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس المیے کے نتیجے میں افسانہ نگاروں نے انفرادی اور اجتماعی تجربوں کو اپنے مخصوص سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر میں رکھ کر نئے نئے زاویوں سے اور کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے افسانے ملک میں رونما ہونے والے واقعات، اجتماعی جبر سے انفرادی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، مصائب و مشکلات میں انسانی امید و بیم کی کیفیات اور نفرت کے ماحول میں پیدا ہونے والے انسانوں کی بربریت کے اظہار سے پُر ہیں۔ یہ افسانے تاریخ تو نہیں لیکن تاریخی سچائیوں اور تاریخی عمل سے جنم لینے والے واقعات اور کردار کے ردِعمل کے مظہر ہیں مگر ان واقعات اور کرداروں کے جمالیاتی پہلوؤں اور فنی اظہار نے ان کو تاریخ کا حصہ بنا دینے کے بجائے ادب کے ذیل میں شامل کیا ہے۔ المیۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے جانے والے افسانے یوں نشانِ عبرت بھی ہیں کہ جب انسان پر سے تہذیب کا لبادہ اترتا ہے تو کس طرح اس کے اندر چھپی ہوئی وحشتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں مگر ساتھ ہی یہ افسانے ہمیں یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ ہم اپنی داخلی قوت کو مجتمع کریں، دشمن کے پھیلائے ہوئے جال سے ہوشیار رہیں اور بے مقصدیت، انتشار اور بدگمانی سے بچ کر انسانی رشتوں کو مضبوط کریں۔''[۸۲]

سقوطِ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ، جتنا بڑا حادثہ تھا۔ تناسب کے اعتبار سے اس قدر افسانے سامنے نہیں آئے، بلکہ المیے کی شدت کے پس منظر میں ان افسانوں کی تعداد کہیں کم محسوس ہوتی ہے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک کے شہری محض چوبیس سال کے عرصے میں ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ لسانی جھگڑے سے شروع ہونے والا معاملہ اس قدر طول اختیار کر گیا کہ ملک دولخت ہو کر رہ گیا، یہ اس قدر بڑا سانحہ تھا کہ جس پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت تھی مگر مصلحتوں کی وجہ سے زیادہ تر ادیبوں نے اس موضوع پر لکھنے سے گریز کیا[۸۳] محمود الحسن کے بقول ''۱۹۷۱ء میں جب پاکستان ایک خطرناک جنگ لڑ رہا تھا۔ پاکستان کے ادیب اور شاعر جنگی نغموں اور فیچروں کے معاوضے کی جنگ لڑ رہے تھے۔''[۸۴] اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے کچھ افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سے اس سانحے کے پس منظر سمیت دیگر تمام پہلوؤں سے قاری کو آگاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے قیامِ پاکستان سے سقوطِ ڈھاکہ تک کے حالات و واقعات پورے پس منظر سمیت بیان کرتے ہوئے سیاسی، معاشی، معاشرتی، لسانی اور انسانی پہلوؤں کا جائزہ لے کر قاری کے سامنے اس سانحے کی ایک مکمل تصویر فنی پیرائے میں پیش کر دی ہے۔ یوں یہ افسانے صرف ادب ہی نہیں بلکہ قومی تاریخ کا بھی ناقابلِ فراموش حصہ بن جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۰۱۔ شہزاد منظر، ''ادب میں انتہا پسندر جحانات''، لاہور، ماہنامہ ''فنون''، نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۴

۰۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''افسانہ''، ادبی زاویہ، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴ء ص ۱۵۳

۰۳۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۰۴۔ ڈاکٹر رشید امجد، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳ء، ص ۴۸

۰۵۔ شہزاد منظر ''افسانہ''، تخلیقی ادب ۲، کراچی، عصری مطبوعات، ۱۹۸۰ء، ص ۹۴

۰۶۔ خالد اقبال یاسر، ''پاکستانیت اور اردو کا نثری ادب''، لاہور، ماہ نامہ، ''فنون''، نومبر دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۷

۰۷۔ سلیم آغا قزلباش، ''اردو افسانے کے پچاس سال''، لاہور، ماہ نامہ ''اوراق''، جنوری فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۸

۰۸۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، پاکستانی زبان و ادب: مسائل و مناظر، لاہور، الوقار پبلشرز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴۰

۰۹۔ ایضاً، ص ۲۴۲، ۲۴۱

۱۰۔ مسعود مفتی، ریزے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۳

۱۱۔ ڈاکٹر انور سدید، ۱۹۷۸ء کے بہترین مقالات، سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۷

۱۲۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۲ء، ص ۵۸

۱۳۔ شہناز پروین، ''مکتی''، کراچی، ماہ نامہ، ''سیپ''، شمارہ نمبر ۳۰، ص ۱۱۲

۱۴۔ آغا سہیل ''پرچم''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۹۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۶۔ شہزاد منظر ''یوٹوپیا''، کراچی، ماہ نامہ ''سیپ''، شمارہ نمبر ۲۴، ص ۱۳۳

۱۷۔ اسد فیض، شہزاد منظر کی ادبی خدمات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، شعبۂ اردو، مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۴

۱۸۔ شہزاد منظر ''یوٹوپیا'' محولہ بالا ۱۶، ص ۱۳۶

۱۹۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، محولہ بالا ۱۲، ص ۵۷۲

۲۰۔ علی حیدر ملک ''پسپائی کا آخری موڑ''، کراچی، ماہ نامہ ''سیپ'' شمارہ نمبر ۲۸، ص ۹۰، ۹۸

۲۱۔ ام عمارہ "بہ گناہی بے گناہی"، کراچی، ماہ نامہ "نقش"، ۶ـ۵/۷۳، ص۷۳

۲۲۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص۳۶۷، ۳۶۶

۲۳۔ انتظار حسین، پس ورق، سارے فسانے، محولہ بالا ۲۲

۲۴۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، لاہور، التحریر، ۱۹۸۱ء، ص۳۵

۲۵۔ ایضاً، ص۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص۵۱

۲۷۔ شہزاد منظر، ندیا کہاں ہے تیرا دیس، کراچی، منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص۷۶

۲۸۔ محمد عثمان رمز، تبصرہ: ندیا کہاں ہے تیرا دیس، لاہور، ماہ نامہ "سیارہ"، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص۴۷۵

۲۹۔ ڈاکٹر شفیق انجم، اردو افسانہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص۲۵۹

۳۰۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۲۱۲

۳۱۔ ایضاً، ص۲۱۲

۳۲۔ ایضاً، ص۱۹۳

۳۳۔ غلام محمد، لہو قطرہ قطرہ، کراچی، نثری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص۶۴، ۶۳

۳۴۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، محولہ بالا ۲۴، ص۴۲

۳۵۔ قیصر قیصری، وطن کا قرض، کراچی، ایوانِ ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص۱۳۸

۳۶۔ ڈاکٹر انور سدید، ۱۹۷۸ء کے بہترین مقالات، محولہ بالا ۱۱

۳۷۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، کراچی، نثری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص۱۷۱

۳۸۔ شہزاد منظر، یوٹوپیا، محولہ بالا ۱۶، ص۱۳۱

۳۹۔ ایضاً، ص۱۲۳

۴۰۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، محولہ بالا ۳۷، ص۲۵۳

۴۱۔ ایضاً، ص۱۲۸

۴۲۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، محولہ بالا ۱۲، ص۵۶۵

۴۳۔ انتظار حسین، قصہ کہانیاں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۸۱

۴۴۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، محولہ بالا ۱۲، ص۵۶۲

۴۵۔ مسعود مفتی، انٹرویو: خالد ہمایوں، لاہور، ماہ نامہ "قومی ڈائجسٹ"، مارچ ۲۰۰۴ء، ص۳۹

۴۶۔ شہزاد منظر، یوٹو پیا، محولہ بالا ۱۶، ص ۱۳۴

۴۷۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۶۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۸۰،۷۹

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۵۰۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، محولہ بالا ۲۲، ص ۳۷۵

۵۱۔ احمد سعدی، مٹی کی خوشبو، ڈھاکہ، شاہکار پبلی کیشنز، س۔ن، ص ۱۱۱

۵۲۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۱۰، ص ۳۱

۵۳۔ غلام محمد، تر شنا، کراچی، نشری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۴

۵۴۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۱۰، ص ۳۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۶

۵۶۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۳۱

۵۷۔ فتح محمد ملک، تحسین و تر دید، راول پنڈی، اثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص ۹۴

۵۸۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، محولہ بالا ۲۱، ص ۲۰۶

۵۹۔ امِ عمارہ، ''کس نے کس کو اپنایا''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، جولائی اگست ۱۹۷۳ء، ص ۸۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۸۳

۶۱۔ ممتاز شیریں، معیار، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲

۶۲۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، محولہ بالا ۱۲، ص ۵۶۳

۶۳۔ راقم کی مسعود مفتی کے ساتھ ایک گفتگو، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۰۶ء

۶۴۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۱۳، ص ۱۵

۶۵۔ رضیہ فصیح احمد، بارش کا آخری قطرہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۶

۶۶۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، محولہ بالا ۳۰، ص ۲۰۹

۶۷۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، محولہ بالا ۲۴، ص ۱۶۰

۶۸۔ رشید امجد، گم شدہ آواز کی دستک، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۶

۶۹۔ صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۵

۷۰۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۱۳، ص ۹۶

۷۱۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا۱۲، ص۱۲۶

۷۲۔ مشرف احمد، ''سرحدیں''، کراچی، ماہ نامہ ''سیپ''، شمارہ نمبر۲۸، ص۸۷

۷۳۔ احمد سعدی، دُودِ چراغِ محفل، ڈھاکہ، شاہکار پبلی کیشنز، س۔ن، ص۵۱، ۵۰

۷۴۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا۱۲، ص۱۵۶

۷۵۔ امتیاز حسین، ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو،
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص۱۷۸

۷۶۔ ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف: ابراہیم جلیس، محولہ بالا۱۳، ص۵۶۸

۷۷۔ ایضاً، ص۵۸۳

۷۸۔ سید وقار عظیم، فنِ افسانہ نگاری، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص۲۶۷

۷۹۔ اے حمید، ''اب جاگتے رہنا ہے''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، مئی اپریل ۱۹۷۲ء، ص۵۹

۸۰۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، تنقیدی تجربے، لاہور، اردو دنیا ۱۹۵۹ء، ص۳۳۵

۸۱۔ قیصر قیصری، نثار احمد زبیری، نورالعین نوید، مرتبین: وطن کا قرض، کراچی، ایوانِ ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص۹

۸۲۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، پاکستانی زبان وادب: مسائل ومناظر، محولہ بالا۸، ص۲۴۳

۸۳۔ مسعود مفتی، مکالمہ، اسلام آباد، سہ ماہی ''ادبیات''، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء، ص۲۱۹

۸۴۔ محمود الحسن، اردو افسانے میں پاکستانیت، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو،
علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۱۳۲

باب چہارم

دیگر اصنافِ نثر پر اثرات

جس طرح سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے سے ہر محبِ وطن پاکستانی متاثر ہوا اسی طرح ادیب بھی اس حادثے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ ہمہ پہلو حادثہ تھا۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کے لیے ہمارے ادیبوں نے مختلف اصناف کو وسیلہ بنایا۔ مسعود مفتی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے پیچیدہ عمل کو تب ہی سمجھا جا سکتا ہے جب مختلف تجربات اور مشاہدات رکھنے والے کئی لوگ اس حادثے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''کسی ایک فرد کے لیے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر دردمند دل جو ڈوبنا جانتا ہے، ہر چشمِ بینا جو دیکھنا جانتی ہے اور ہر فہم و ادراک جو تجزیہ کر سکتا ہے، اپنے مشاہدات کو قلمبند کر دے تاکہ اس پیچیدہ عمل کے کسی نہ کسی پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ سکے اور ہم جو آیندہ نسلوں کے سامنے فوجی شکست اور قومی ریخت کے مجرم ہیں اتنا مواد چھوڑ سکیں کہ وہ اس کے مختلف تراشوں کو جوڑ کر ایک مربوط داستان مرتب کر سکیں''۔[۱]

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پسِ منظر میں لکھے گئے نثری ادب میں زیادہ تحریریں افسانے اور ناول کی صورت میں سامنے آئیں جن کا پچھلے ابواب میں جائزہ لیا جا چکا ہے۔ مگر اس کے علاوہ ہمارے ادیبوں نے رپورتاژ، ڈائری، ناولٹ، ڈرامہ، خطوط اور روداد جیسی اصناف کے ذریعے بھی اس سانحے کے مختلف پہلوؤں کو قاری کے سامنے پیش کیا۔ ہر صنف اپنے ایک خاص مزاج کے باعث ایک مخصوص لب و لہجہ رکھتی ہے اور اسی لب و لہجہ میں اپنا آپ قاری پر منکشف کرتی ہے۔

رپورتاژ

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھنے والے رپورتاژ نگاروں میں مسعود مفتی کا نام اہم ہے۔ اُن کی پہلی رپورتاژ ''چہرے'' کے نام سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ رپورتاژ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے حادثے کے بعد کے دنوں کی داستان سناتی ہے جب مصنف کو اپنے دیگر ساتھیوں سمیت ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں پناہ لینا پڑی جہاں یہ لوگ پانچ دن مقیم رہے اور وہاں سے ۱۹ دسمبر کو باضابطہ جنگی قیدی بنا کر ڈھاکہ چھاونی منتقل کر دیا گیا۔

''ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں گزارے ہوئے پانچ دنوں میں نہ صرف عظیم سیاسی تبدیلی دیکھنے میں آئی بلکہ ہم لوگ ایک جان لیوا قلبی واردات اور لامحدود ذہنی کرب سے گزرے۔ یہ رپورتاژ ان دنوں کی زندگی کی ہلکی سی جھلک ہے۔'' [۴۲]

اس موضوع پر مسعود مفتی کی دوسری رپورتاژ ''ہم نفس'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورتاژ میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بنگالیوں کی غالب اکثریت متحدہ پاکستان کی خواہش مند تھی مگر حکومتی حلقوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور پھر اقلیت اکثریت پر غالب آگئی۔ ''''ہم نفس'' میں میں نے یہ بات واضح کی ہے کہ ہم نے اس بنگالی کو نظر انداز کیا جو پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔''[۴۳] مسعود مفتی اس رپورتاژ میں اسی پُرشور اقلیت کے ہاتھوں خاموش اکثریت کی شکست کی کہانی بیان کرتے ہیں۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پسِ منظر میں لکھی گئی تیسری رپورتاژ فہمیدہ ریاض کی ''زندہ بہار'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے یہ رپورتاژ کراچی کے سہ ماہی جریدے ''آج'' میں قسط وار شائع ہوئی۔ فہمیدہ ریاض کو بنگلہ دیش کی اٹھارویں سالگرہ پر ڈھاکہ جانے کا موقع ملا تو انھوں نے وہاں جا کر حالات کا مشاہدہ کیا اور کئی سوال اٹھائے۔ اس رپورتاژ میں فہمیدہ ریاض بنگلہ دیش کے حال کو اس کی تاریخ اور اس کے ماضی کے آئینے میں رکھ کر دیکھتی ہیں۔ ذیل میں ہم ان تینوں تحریروں کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مسعود مفتی نے پہلی رپوتاژ ''چہرے'' میں متحدہ پاکستان کے آخری چند دنوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس رپورتاژ میں انہوں نے ریڈ کراس کی تحویل میں غیر جانبدار قرار دیئے گئے علاقے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں گزارے گئے دنوں کی کہانی، وہاں موجود لوگوں کے چہروں کے تاثرات کے حوالے سے بیان کی ہے۔ ان چہروں میں غیر ملکی صحافیوں، مایوس مغربی پاکستانیوں، متحدہ پاکستان کے خواہش مند مشرقی پاکستانیوں اور بہاریوں کے علاوہ متفرق افراد کے چہرے شامل ہیں۔ مسعود مفتی نے اس رپورتاژ میں مذکورہ چہروں کو خوب صورت ادبی انداز میں بیان کر دیا ہے۔ جنگ کے ان آخری دنوں میں ان چہروں سے سارے نقاب اتر چکے تھے اور ان کا اصل روپ سامنے آ چکا تھا، مسعود مفتی خود بھی ان چہروں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انھیں قاری کے سامنے بھی پیش کرتے ہیں۔

''یہ بڑے ہی عجیب چہرے ہیں۔ اس لیے کہ قریباً قریباً اصل رنگ میں نظر آرہے ہیں جو عام حالات میں کبھی نہیں ہوتا۔ عام طور پر تو ہم چہرہ نہیں دیکھتے، فقط ان نقوش کو دیکھتے ہیں جو ایک چہرے کا روپ دھارے ہیں۔۔۔۔۔۔ مگر یہ چہرے ایسے حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ وقت نے ان کے سارے نقاب نوچ کر پھینک دیئے ہیں اور انھیں ابھی یہ مہلت نہیں ملی کہ مستقبل کے لیے نئے نقاب کا انتخاب کر سکیں۔ [۴۴]

مسعود مفتی اس رپورتاژ میں جن چار لوگوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں پہلی قسم ان غیر ملکیوں کی ہے جو طویل عرصے سے مشرقی پاکستان میں موجود تھے مگر ان کی تمام حرکات ایسی تھیں جس کے سبب مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فاصلہ بڑھا اور نفرتوں کو ہوا ملی۔ مسعود مفتی ان کرداروں کے چہروں کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''پہلی قسم غیر ملکی چہروں کی ہے جو نامہ نگاروں، اخبار نویسوں اور تاجروں کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں مگر ان میں سے کافی پہلے بھی یہاں موجود تھے اور آج بھی ہیں ان میں کئی ایسے ہیں جو اس دن کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور آج پاکستان کی گردن کو آہستہ آہستہ جھکتا دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں۔'' ۵

ہوٹل میں موجود دوسری قسم ان چہروں کی ہے جن کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے اور جو مختلف ملازمتوں وغیرہ کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں قیام پذیر تھے کہ یہ دن آن پہنچا جب انھیں پاکستان کی شکست واضح نظر آنے لگی اور ان کے سامنے ان حالات سے فرار کی کوئی راہ نہ رہی۔ مسعود مفتی نے مایوسی کے ان لمحات میں ان مغربی پاکستانیوں کے دلوں کے جذبات کی نہایت خوبصورت عکاسی کی ہے۔

''ان کی مایوس نظریں دیکھ رہی ہیں کہ کشتی ڈوب رہی ہے۔ سمندر مگرمچھوں اور نہنگوں سے اٹا پڑا ہے۔ اور ساحل دور ہے۔۔۔۔۔۔ بہت دور۔۔۔۔۔۔ جہاں سے یادوں کے دوش پر بچوں کے ننھے منھے ہاتھ ان کو بلا رہے ہیں۔ بیویوں کے بھیگے آنچل انہیں سہارے دینے کو بے چین ہیں۔ مائیں اور بہنیں بلائیں لے رہی ہیں۔ مگر یہ سب ''اب کیا ہوگا'' کے بھنور میں غائب ہو رہا ہے۔'' ۶

ان چہروں میں تیسری قسم ان چہروں کی ہے جو بنگالی ہونے کے باوجود متحدہ پاکستان کے حامی تھے۔ انہوں نے متحدہ پاکستان کی سالمیت کی آخری وقت تک جدوجہد کی اور اس کی حمایت میں ہر طرح کی تکالیف کا سامنا کیا۔ مسعود مفتی نے اس مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ حکمرانوں نے ان محبِ وطن پاکستانیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور انھیں علاحدگی پسند عناصر کے سامنے بے بسی کی حالت میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ جس کے سبب ان کے دلوں میں بجا طور پر اس احساس نے جنم لیا کہ شاید حکمران مشرقی پاکستان کے حالات سے دانستہ بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ ان لوگوں نے متحدہ پاکستان کے لیے ہر ممکن قربانی دی مگر ان کی تمام تر کوششیں رائیگاں گئیں تو یہ لوگ مایوسیوں میں گھر کر رہ گئے۔ مسعود مفتی ان کے باطن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے دلوں پر کیا بیتی۔ وہ ان لوگوں کی داخلی کیفیات کو خالص ادبی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

''آج جب ان کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ زندہ لاشیں لگتی ہیں۔ زندگی کی کوئی رمق ان

میں باقی نہیں رہی۔۔۔۔۔۔یہ مسکراتے بھی ہیں مگر ایسی مسکراہٹ جو درد کو چھپانے کے لیے خالص مشینی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ان میں سے کئی کے ساتھ بیویاں اور بچے بھی ہیں۔مگر یہ ان سے مجرموں کی طرح آنکھیں چرا رہے ہیں۔ان کے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔'' ۷

چوتھی قسم ان چہروں کی ہے جو''بہاری'' کہلاتے ہیں۔یہ لوگ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی تحریک میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔یہ جانتے ہوئے کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے،۱۹۴۷ء میں ان لوگوں نے قیام پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر مشرقی پاکستان پہنچے مگر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی سالمیت کی حمایت میں یہ لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔مسعود مفتی ہوٹل میں موجود چند بہاریوں کے چہروں کے ذریعے اس طبقے کے ہر فرد کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ہوٹل میں موجود ایک بہاری چہرے کے جذبات اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

''وہ خشمگیں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے میری بات کاٹ دیتا ہے۔ دیکھئے صاحب !سزا اور جزا کا مسئلہ اپنے پاس رکھیئے۔مجھے معلوم نہیں قوموں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔میں تو یہ جانتا ہوں اپریل میں میرا دو سالہ بچہ مارا گیا۔۔۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔۔۔میرا تین ماہ کا بچہ مارا جائے گا۔۔۔۔۔۔ان کو کس عمل کی سزا مل رہی ہے۔۔۔۔۔۔اور اس عمر میں ان کے اعمال کیا ہیں؟۔۔۔۔۔۔اور اگر یہ قوم کی سزا ہے تو اس کے لیے ہر دفعہ میرا ہی گھرانہ کیوں چنا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔قوم میں اور لوگ نہیں ہیں کیا؟'' ۸

مسعود مفتی ان چار اقسام کے چہروں کے ذکر کے بعد آگے بڑھتے ہیں اور ارتکائی حالات طے کرتے حالات میں قاری کو اس طرح شامل کرتے ہیں کہ جیسے شکست کے ان لمحوں کا وہ خود بھی شاہد ہو۔وہ قاری کو شکست کے ان آخری لمحات میں شامل کرتے ہوئے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء میں لے جاتے ہیں اور اپنے دل میں اٹھنے والے جذبات کو قاری کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔مسعود مفتی کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ انسان کے باطن کی تصویریں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔

''میں موم بتی بجھاتا ہوں تو اندھیرا چاروں طرف سے مجھے دبوچ لیتا ہے۔۔۔۔۔۔اتنا تاریک اندھیرا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔کیوں کہ شہر میں بلیک آؤٹ کا اندھیرا،کمرے میں تاریکی کا اندھیرا اور میرے اندر مایوسیوں کا اندھیرا ہے۔کہیں بھی روشنی کی کرن نظر نہیں

آتی ۔ نہ تن کے باہر نہ من کے اندر۔ اس تاریکی میں بال برابر وسوسے بھی دیو قامت بن کر
مجھے ہیبت دلا رہے ہیں اور ظلمت لامحدود اور اتھاہ بن کر رہ گئی ہے۔'' ۹

رپورتاژ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ''سب سے اہم چیز رپورتاژ کا خارجیت سے داخلیت کی طرف رجحان ہے اور یہی رجحان اسے صحافت، تاریخ، سفرنامے، افسانے اور ناول سے جدا کرتا ہے اور رپورتاژ کو ایک منفرد حیثیت بخشتا ہے۔'' ۱۰ اگر ہم اس حوالے سے مسعود مفتی کی اس رپورتاژ کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس رپورتاژ میں مسعود مفتی نے انسان کی داخلی کیفیت کی زبردست تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے انسان کے داخل میں جھانک کر اُس کی باطنی کیفیات کو الفاظ کا رنگ دے دیا ہے۔ ان داخلی کیفیات کی عکاسی کا ایک منظر ہمیں اس وقت نظر آتا ہے جب ۱۶ دسمبر کو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے جاتے ہیں۔

''میرے اردگرد سب چہرے فق ہیں۔ اب ہم بنگلہ دیش میں بیٹھے ہیں۔۔۔ ہماری حسیات
مفلوج ہیں۔ پاؤں تلے زمین محسوس نہیں ہوتی۔ سر پر چھت نظر نہیں آتی۔ دیواریں کہیں غائب
ہو گئی ہیں۔۔۔ سائے غلط ملط ہیں۔ سکڑتا۔ پھیلتا۔ پھیلتا کہرا ہے۔ اس بے پایاں کہرے کی
دھند کی کوکھ سے ''انہونی'' جنم لیتے لیتے ''ہو'' جاتی ہے۔۔۔ دُور بہت دُور۔۔۔ یقین اور
بےیقینی کے ہیولے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔'' ۱۱

مصنف ہوٹل کے کمرے سے ڈھاکہ کے مختلف مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان ہی مناظر میں ڈھاکہ ریڈیو کی عمارت کے باہر پیش آنے والا واقعہ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ قاری کو بھی اس دلدوز منظر میں شامل کر لیتے ہیں۔

''اب ہجوم دیوانہ وار اندر گھس جاتا ہے۔ دو آدمی چھت پر چڑھ چکے ہیں۔ وہ پاکستان کا جھنڈا
کھینچ کر نیچے اتارتے ہیں۔ اسے پھاڑتے ہیں اور اس کے پرزوں کو پاؤں تلے روندتے
ہیں۔

اپنا پرچم اور اپنے ہی پاؤں۔۔۔۔۔۔۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

پھر بنگلہ دیش کا پرچم پھڑپھڑانے لگتا ہے۔۔۔۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ بارہ بج کر انتیس
منٹ۔ ہمارے کمرے میں چند سسکیاں ابھرتی ہیں۔ ایک چہرہ تو بلک بلک کر رو دیتا ہے'' ۱۲

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، مسعود مفتی کی اس رپورتاژ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ دور سے منظر کو دیکھنے والے کسی نامہ نگار کی رپورٹ ہے نہ کسی غیر متعلق دانش ور کی

طوطا کہانی۔ یہ آپ بیتی ہے، وطن بیتی ہے اور اپنے وجود کے ایک حصے کی قطرہ قطرہ ریزہ ہوتی اور کرتی موت کا بیان ہے۔ مسعود مفتی کے قلم نے ضبط کے آنسو پیتے ہوئے اس المیے کو رقم کیا ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانے والی یہ سب سے بلند پایہ ادبی تحریر ہے۔'' ۱۳

سقوط مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی مسعود مفتی کی دوسری رپورتاژ ''ہم نفس'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورتاژ کے آغاز میں ۱۹۸۲ء کے دور کا ذکر کیا گیا ہے جب مصنف فلپائن میں مقیم تھے اور وہاں ان کی ملاقات ان کے ایک پرانے دوست لطف الرحمان عرف بھولا سے ہوئی جو بیمار ہے اور ہسپتال میں داخل ہے۔ اس کے بعد فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اور مصنف قاری کو ۱۹۵۸ء کے زمانے میں لے جاتے ہیں جب وہ دیگر دوستوں کے علاوہ لطف الرحمان عرف بھولا کے ساتھ سول سروس اکیڈمی میں ملازمت کے لیے ابتدائی تربیت لیتے ہیں۔ اس موقع پر مصنف لطف الرحمان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

> ''بھولا! یہ لطف الرحمان کا بچپن کا نام تھا جو سکول میں اس کے ساتھ پروان چڑھا۔ کالج میں یونیورسٹی میں اصل نام سے زیادہ استعمال ہوا اور اب اکیڈمی میں وارد ہو گیا۔ یہ فوراً ہی تسلیم کر لیا گیا کیونکہ یہ اسم بامسمیٰ تھا'' ۱۴

پھر ایک سال کے عرصے پر مشتمل ان دنوں کا تذکرہ ملتا ہے جب تمام لوگ تربیت کے لیے انگلستان روانہ ہو جاتے ہیں۔ انگلستان سے واپسی پر مصنف کی تعیناتی مغربی پاکستان میں ہوئی مگر اسے مئی ۱۹۷۱ء میں اس وقت مشرقی پاکستان میں تعینات کر دیا گیا جب وہاں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی فوجی کاروائی عمل میں لائی جا چکی تھی اور حالات ایک نیا موڑ مڑ رہے تھے۔

مصنف مئی ۱۹۷۱ء کے ان دنوں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ متحدہ پاکستان سے محبت کرنے والے بنگالی اکثریت میں تھے اور علاحدگی پسند اقلیت میں مگر ان محب وطن عناصر کی دل جوئی نہ کی گئی بلکہ ایسے اقدامات سامنے آئے کہ ان عناصر کی حوصلہ شکنی ہوئی اور باغیوں کے حوصلے بڑھے۔ مسعود مفتی ''ہم نفس'' میں انہی محب وطن عناصر کی عکاسی کرتے ہیں۔

> '''' ہم نفس'' میں میں نے یہ بات واضح کی ہے کہ ہم نے اس بنگالی کو نظر انداز کیا جو پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ یہ کتاب دراصل میرے ایک Batch Mate کی داستان ہے۔ جب ہم پہلے پہل ٹریننگ پر گئے تو وہ میرا روم میٹ تھا۔ اس کی پاکستان سے محبت کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ وہ آخری دن تک کھلم کھلا پاکستان کی حمایت کرتا رہا اور ہمارے ساتھ رہا۔ ''ہم نفس'' میں دراصل میں نے اسی کی کہانی لکھی ہے۔'' ۱۵

مسعود مفتی نے اس دوست کی کہانی کے ذریعے مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات کے کئی نئے پہلو روشناس کرائے ہیں۔ ان کا اسلوب خالص ادبی ہے چنانچہ وہ جب ڈھاکہ کی زندگی کا عکس کھینچتے ہیں تو قاری کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔

> ''ڈھاکہ کے برگ وگل ویسے ہی سرسبز و رنگین اور تروتازہ تھے جیسے بارہ برس پہلے تھے مگر گلیوں سڑکوں میں گھومتے والے چہرے کملا گئے تھے۔ مکانوں کے دریچوں سے بے دلی جھانکتی تھی۔ بازاروں کے شور و غوغا بھی ضبط سے داغ داغ لگتے تھے۔۔۔۔۔ زندگی کی ہمک نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور اس کی بجائے ہلکے کہرے کی مانند اجنبیت ہر طرف چھائی تھی۔'' ۱۶

یہ وہ دن تھے جب ڈھاکہ میں اردو بولنے والے بنگالیوں اور بہاریوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا گیا تھا۔ مصنف نے جہاں ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے وہاں پاکستانی فوج کی طرف سے بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کا بھی ذکر کیا ہے تاکہ تصویر کے دونوں رُخ واضح ہو کر قاری کے سامنے آ سکیں اور تاریخ کا حصہ بن سکیں۔

> ''۔۔۔۔۔۔۔۔ فوج سمجھے گی کہ میں ان کے خلاف شہادتیں جمع کر رہا ہوں۔ نہ معلوم کس کا ایجنٹ ہوں۔۔۔ ایک دن پکڑ کے لے جائے گی اور پھر میرا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ جس طرح اب بھی کئی لوگ لاپتہ ہیں اور ان کے عزیز مارے مارے ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔ میں بنگالی ہوں۔۔۔ اور بنگالی کا خون معاف ہے۔'' ۱۷

فوج کے کچھ افراد کے ناروا رویوں کے باعث محبِ وطن بنگالی بھی فوج کو ظالم خیال کرنے لگے جس کے نہایت منفی نتائج برآمد ہوئے۔

فوجی آپریشن کے بعد علاحدگی پسندوں کی بڑی تعداد بھاگنے یا روپوش ہونے پر مجبور ہو گئی اور محبِ وطن پاکستانیوں نے سکھ کا سانس لیا مگر کچھ ہی عرصے بعد حکومت نے عام معافی کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں بے شمار باغی جو بھارت فرار ہو گئے تھے وہاں سے تربیت لے کر واپس آ گئے اور ایک بار پھر زیادہ شدت کے ساتھ ملک دشمن کارروائیوں میں مصروف ہو گئے جب کہ حکومت کے اس فیصلے سے محبِ وطن بنگالی ایک بار پھر ان باغیوں کے رحم و کرم پر رہ گئے۔

> ''بھولا اس دن بہت دلگیر تھا۔ جب معافی کا اعلان ہوا۔ کہنے لگا ''میں نے کئی بنگالیوں کو روتے دیکھا ہے۔ یہ درست کہ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔ مگر اس مملکت میں بھی لوگ بستے ہیں اور جب حکومت کے کسی قدم سے وہ اپنی جان اور مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں تو ان کا اعتماد ٹوٹنے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حکومت سارے باغیوں کو قتل

کردے مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ حکومت باغیوں کو یہ سہولت نہ دے کہ وہ آزادی سے دوسروں کو قتل کرسکیں۔''۱۸

مسعود مفتی متحدہ پاکستان کے ڈھاکہ کے آخری دنوں کے چشم دید گواہ ہیں۔ انھوں نے وہاں کے حالات نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھے بلکہ دل سے محسوس بھی کیے۔ انھوں سے علاحدگی پسند عناصر کے ساتھ ساتھ محب وطن بنگالیوں کی کیفیات اوران کے جذبات کا مشاہدہ کیا اور انھیں رپورتاژ کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کیا۔ یہ وہ حقائق ہیں جو تاریخ کی کتابوں سے کبھی سامنے نہیں آسکتے بلکہ ان تک رسائی کے لیے لوگوں کے دلوں میں اُترنا پڑتا ہے اور دائیں بائیں موجود حالات وواقعات کے باطن میں جھانکنا پڑتا ہے۔ مسعود مفتی ابتلا کے اس دور میں لوگوں کے دلوں میں اتر کر ان کے جذبات اور محسوسات تک رسائی میں کامیاب ہوئے اوراس سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اسی شدت کے ساتھ قاری تک منتقل کیا ہے۔ وہ خانہ جنگی کے آخری دنوں میں اپنے محب وطن بنگالی دوست کے جذبات بیان کرتے ہیں جس کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستانی حکمرانوں کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔

'' ''پھر تمھارے خیال میں کیا کرنا چاہیے'' میں نے پوچھا۔ ''جو کرنے کی ضرورت تھی وہ تو کیا نہیں جارہا۔۔۔'' وہ بات کرتے کرتے رک گیا پھر بولا ''دیکھو پارٹنر! ہم وفادار بنگالی یہ خانہ جنگی ہار چکے ہیں اور ہمیں باغیوں نے نہیں ہرایا بلکہ حکومت کی پالیسیوں نے ہرایا ہے۔ لہٰذا اب بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔''۱۹

مسعود مفتی نے اس رپورتاژ میں اس بات پر زور دیا ہے کہ حکومت نے عام معافی کے اعلان سے لے کر دیگر بہت سے اقدامات اس نوعیت کے اٹھائے کہ جن سے علاحدگی پسندوں کو فائدہ ہوا اور محب وطن عناصر کے حوصلے پست ہوئے۔ اس رپورتاژ میں مسعود مفتی نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ بنگالیوں کی اکثریت علاحدگی نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کن مصلحتوں کے تحت ان کی آواز کو دبا دیا گیا۔

''اس صورت حال کے باوجود بھولا ان علاقوں میں بدستور دورے پر جاتا تھا جہاں ذرائع آمدورفت معطل نہ تھے۔ ایک دن دورے سے واپس آیا تو بہت افسردہ تھا۔ کہنے لگا ''ایک امن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کا موقع ملا جس میں پاکستان کے بہی خواہ بہاری اور بنگالی سبھی شامل تھے اور برملا اظہار کررہے تھے کہ ہم لوگوں کو قتل کے بعد یا تو اجتماعی قبریں ملیں گی یا گدھ ہمارا گوشت کھائیں گے اور کل کو ہماری کھوپڑیاں اور ہڈیاں بنگلہ دیش اور ہندوستان کے سکولوں کی لیبارٹریوں میں تعلیم کے لیے استعمال ہوں گی اور یہ سب اس لیے ہوگا کہ حکومت ان کی وفاداریوں کو موثر طریقے سے استعمال نہیں کررہی یا کرنا نہیں چاہتی'' ۲۰

حکومت کا یہ طرزِ عمل اس وقت بھی جاری رہا جب ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔

"بنگالی اور بہاری دونوں پوچھتے ہیں کہ ہم اس جنگ کا ایندھن بننے کو تیار ہیں۔ سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں کیونکہ ہمارے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ مگر ہمیں کوئی بتاتا ہی نہیں کہ ہم کیا کریں؟ کیسے قربانیاں دیں؟" ۲۱

مگر حکومت نے نہ پاکستان کے وفادار بنگالیوں اور بہاریوں کی خدمات سے کوئی فائدہ اٹھایا، نہ ہی اس مسئلے کو بروقت اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش کیا اور نہ ہی اس فارمولے پر کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا، پر عمل کرتے ہوئے مغربی محاذ سے بروقت اور زوردار حملہ کیا۔ یہ سارے ایسے نکات تھے کہ جو لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کو جنم دینے کا باعث بنے۔ لوگ یہ سوچنے لگے کہ شاید مغربی پاکستانی حکمران مشرقی پاکستان سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہی سوال محبِ وطن بنگالیوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث تھا۔

"بھولا اور دوسرے لوگ پوچھتے رہے کہ پاکستان یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ میں پیش کیوں نہیں کرتا؟ اور مغربی پاکستان سے حملہ کیوں نہیں ہوتا؟ مغربی پاکستانی ہونے کے ناطے وہ ہمیں طعنے دیتے رہے مگر ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نور الامین اور پروفیسر غلام اعظم جیسے لیڈر مغربی پاکستان سے حملے کا تقاضا کرتے رہے۔ سول ڈیفنس کا محکمہ سویا رہا۔ ڈھاکہ کی بجلیاں چمک چمک کر جلتی رہیں۔ نہ بلیک آؤٹ نہ کرفیو۔ وفادار بنگالی ہدایات ڈھونڈتے رہے کہ وہ کیسے اپنی جانیں قربان کر کے ملک کو بچا سکتے ہیں۔" ۲۲

۲۲ نومبر کو ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تک یہی کہا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا مگر خدا معلوم کن مصلحتوں کے تحت مغربی پاکستان کا محاذ خاموش رہا۔ مشرقی پاکستان کے محبِ وطن پاکستانی اس صورتحال کو سمجھنے سے قاصر تھے اور مغربی پاکستان کے خلاف ان کا غم و غصہ بڑھتا رہا۔

"" وہ بھی یہی سوال پوچھتا ہے کہ اگر یہ جنگ ہے تو پھر مغربی محاذ پر حملے میں تاخیر کیوں۔۔۔۔۔۔ میں پوچھتا ہوں" وہ جوش میں کھڑا ہو گیا" کیا مغربی پاکستان تماشا دیکھ رہا ہے کہ مشرقی پاکستان مرنے میں کتنی دیر لے گا؟" میں سوچ رہا تھا کہ یہ سوال صرف بھولا کی طرف سے ہی نہیں بلکہ سارے مشرقی پاکستان کی طرف سے ہے اور کئی لوگ برملا پوچھ رہے ہیں" ۲۳

اسی طرح مشرقی پاکستان میں جنگ کے دوران میں بھی بے دلی کا سماں تھا۔ ایک دفعہ مصنف کو جب سول ڈیفنس کے ہیڈ کوارٹر میں جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ وہاں جا کر کنٹرول روم کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ اس کنٹرول روم

کی تصویر کشی اس انداز میں کرتے ہیں کہ قاری کو جنگ کی اندرونی صورتحال سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔

''کنٹرول روم کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس پتلے کا تصور ابھرا جو کسان پرندوں کو ڈرانے کے لیے اپنے کھیتوں میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ دو لکڑیوں کا کراس، اس پر پرانا کوٹ اور ٹوپی، نہ روح نہ جسم، نہ حرکت، ناسمجھ پرندوں کے لیے حقیقت، سمجھ دار انسانوں کے لیے دھوکا۔۔۔۔ برعظیم میں ایک ہزار سال سے کفر سے نبرد آزما ہونے والے مسلمان بیسویں صدی کی جنگ اس انداز سے لڑ رہے تھے جیسے جنگ کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں۔'' ۲۴

انہی حالات میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کا سانحہ رونما ہوتا ہے مگر مصنف نے اس دن کی کیفیات اور جذبات و احساسات کو زیادہ تفصیلی انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ ایک آدھ سطر میں ہی اس کا حوالہ دیا ہے۔ یقیناً اس کی وجہ یہ ہے کی انھوں نے اس حوالے سے اپنے جذبات واحساسات کو اپنی پہلی رپورتاژ ''چہرے'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مصنف اپنے دیگر ساتھیوں سمیت بھارت کی قید میں چلے جاتے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں انھوں نے قید کے ان دنوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں بھی انھوں نے اپنے مخصوص ادبی اسلوب کو برقرار رکھا ہے جو ان کی رپورتاژ کو ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

''دشمن کی قید گھنگھور گھٹا کی طرح مکمل ہوتی ہے۔ بے داغ سیاہی، کڑکتی چمکتی بجلیوں سے لرزتی ہوئی، پابندیاں ظلم کی کوکھ سے نکلتی ہوئی، ملاقات کے تصور سے بھی خالی اور عملے کی جانی دشمنی سے شرابور۔ اردگرد انسان کہیں نہیں ہوتا فقط دشمن ہوتا ہے۔ انسانیت اگر کہیں ہوتی ہے تو بندوق کی نالیوں سے مرجاتی ہے۔ قیدی یہ سمجھتا ہے کہ خدا دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔۔۔ اور خدا؟؟ نہ معلوم چپ کے سے کدھر چلا جاتا ہے۔ ظلم دیکھتا ہے، نہ فریاد سنتا ہے نہ دعا وصول کرتا ہے۔۔۔ شاید خدا کا یہی انداز جہنم کہلاتا ہے۔'' ۲۵

مسعود مفتی کی اس رپورتاژ کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہمارے حکمرانوں کا شعوری عمل تھا۔ انھوں نے اس رپورتاژ میں اس سارے سانحے کا نہایت گہرا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے خیال میں مشرقی پاکستان میں موجود محبِ وطن پاکستانیوں کی طرف حکومت نے کوئی توجہ نہ دی اور جنگ بھی نہایت بے دلی کے ساتھ لڑی گئی، جس کا نتیجہ سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آیا۔ وہ اردگرد کے ماحول اور افراد کے باطن مین جھانک کر اس کی کیفیات قاری تک پہنچانے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ''ہم نفس'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'''' ہم نفس'' اس سانحۂ ارتحال کی مفصل تر اور آنسوؤں آہوں سے گندھی داستان ہے جسے کہانی، افسانے، ناول، سفرنامہ، آپ بیتی اور رپورتاژ کی فنی کرچیوں سے جوڑ کر ترتیب دیا گیا

ہے۔ یہ شکستہ آئینہ ہے جس میں اس سانحے کے سب کرداروں کو اپنی مسخ شدہ صورت بڑی واضح نظر آسکتی ہے۔ اس کے کردار چند گنتی کے لوگ نہیں بلکہ اس وقت کے سب چودہ کروڑ مغربی پاکستانی، مشرقی پاکستانی اور بھارتی افواج کے سپاہی ہیں۔ یہ تحریر گویا ''چہرے'' اور ''ریزے'' کا تتمہ ہے۔'' ۲۶ے

سقوطِ ڈھاکہ کے پسِ منظر میں لکھی گئی تیسری رپورتاژ فہمیدہ ریاض کی ''زندہ بہار'' ہے جو ۱۹۹۶ء میں کتابی صورت میں چھپی۔ یہ رپورتاژ براہِ راست سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع سے متعلق نہیں کیونکہ یہ سقوطِ ڈھاکہ کے اٹھارہ سال بعد اس وقت کے حالات وواقعات کو دیکھ کر لکھی گئی جب مصنفہ کو بنگلہ دیش کی اٹھارویں سالگرہ پر ڈھاکہ جانے کا موقع ملا۔ اس کا پہلا ذیلی عنوان ہی ''ڈھاکہ: ۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ء'' ہے۔ اس رپورتاژ میں مصنفہ بنگلہ دیش کی اٹھارویں سالگرہ کے موقع پر منائے جانے والے جشن کا احول بھی بیان کرتی ہیں اور سابقہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان زبان اور تہذیب وثقافت سمیت دیگر مسائل پر بھی بات کرتی ہیں۔ اور ایسے سوالات اٹھاتی ہیں جن کا کسی کے پاس جواب نہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ مظفر علی سیّد نے لکھا ہے۔ وہ دیباچے میں اس کی خاصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''فہمیدہ بجا طور پر سوال کرتی ہیں کہ ضم ہونا کیوں ضروری ہے جب کہ معاشرہ تو نام ہی متنوع چیز کا ہے۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملتا، کئی دوسرے سوال ایسے ہیں جن کا بس اتنا جواب ملتا ہے کہ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ کوئی بات ہو بھی تو یہی سنائی دیتا ہے کہ کچھ واضح نہیں ہے۔'' ۲۷ے

المیۂ مشرقی پاکستان کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے طبقے ''بہاریوں'' کا بھی وہ بطور خاص ذکر کرتی ہیں۔ وہ قاری کو بتاتی ہیں کہ اٹھارہ سال گزر جانے کے باوجود وہ لوگ کس کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور آج بھی ان کے دلوں میں پاکستان جانے کی آس موجود ہے۔

فہمیدہ ریاض نے اس رپورتاژ میں بنگلہ دیش کے اٹھارویں یومِ آزادی کے موقع پر منائے جانے والے جشن کا احوال اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری مغربی پاکستانیوں کے بارے میں اہلِ بنگال کے جذبات سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر مختلف اخبارات میں لکھے گئے اداریوں کے اقتباسات بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ ان اداریوں میں اس بات کو ابھارا گیا ہے کہ بنگالی قوم نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک ظالم، خوفناک اور ہتھیار بند فوج سے آزادی حاصل کی تھی۔ اسی طرح ایک اخبار میں شائع شدہ ایک شہید کی والدہ کی ڈائری کے چند صفحات بھی انھوں نے کتاب میں شامل کیے ہیں جو اگست ۱۹۷۱ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۱ء کے مختلف دنوں کی روداد پر مبنی ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے جلوس کا بھی احوال بیان کیا ہے، جس کے شرکاء جنرل یحییٰ خان سے اپنی نفرت کا اظہار

کرر ہے ہیں۔

"یہ ہجوم جو دراصل بڑا جلوس تھا پُر جوش نعرے لگا رہا تھا۔ جلوس کے وسط میں ایک ٹرک پر جنرل یحییٰ کا پُتلا نصب تھا۔ خوفناک چہرے پر دو بڑے بڑے ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دانت بھی بنا دیئے گئے تھے۔ ٹرک پر سوار نوجوانوں کا گروہ پتلے کی ایسی جُوتا کاری کر رہا تھا کہ وہ بار بار گر جاتا تھا پھر اسے ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔" ۲۸

فہمیدہ ریاض کی اس رپورتاژ میں المیۂ مشرقی پاکستان کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے طبقے بہاریوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ وہ قاری کو بتاتی ہیں کہ اٹھارہ سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ لوگ کس کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ ایک بہاری کیمپ کی عکاسی ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

"یہ بہاریوں کا کیمپ ہے۔ پہلی نظر میں اسے انسانی رہائش نہیں سمجھا جا سکتا۔۔۔ سرکنڈوے کے رہائشی مکعب ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ اگر آپ کیچڑ اور غلاظت کو کسی طرح نظر انداز کر بھی دیں تو سرکنڈے کے رنگ بناوٹ کے باعث یہ کیمپ شہد کی مکھیوں کا ایک بہت بڑا چھتا معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر طرف انسان مکھیوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔" ۲۹

بہاریوں کے اس کیمپ میں مصنفہ کے ساتھ ڈھاکا یونیورسٹی کے پروفیسر خلیق بھی موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان سے بہاریوں کے مسائل پر گفتگو کرتی ہیں تو ان کی مخدوش صورت حال مزید واضح ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

"''کیا یہ کوئی نوکری نہیں کر سکتے'' میں نے انگریزی میں پروفیسر خلیق سے پوچھا۔ ایسا ہے کہ قومیت کے خانے میں تو۔۔۔ یہ۔۔۔ پاکستانی لکھتے ہیں نا۔ نوکری کیسے مل سکتی ہے؟ انہوں نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''تب تو یہ مکان بھی نہیں خرید سکتے ہوں گے؟'' جی۔۔۔ میرا تو خیال نہیں ہے کہ انہیں ایسی اجازت مل سکے گی موجودہ صورتحال میں۔" ۳۰

اس رپورتاژ میں فہمیدہ ریاض نے بہاریوں کے مسئلے کو نہایت موثر انداز میں اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنا گھر بار چھوڑ کر مشرقی پاکستان میں آباد ہونے والے ان لوگوں کی بے بسی کو قاری کے سامنے اجاگر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ لوگ ۱۹۴۷ء میں اپنا سب کچھ لٹوا کر امن اور سکون کی تلاش میں مشرقی پاکستان میں آباد ہوئے مگر ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر اُن کو بے گھر کر دیا گیا اور وہ بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۱ء کے دنوں میں پیش آنے والے واقعات اور ان واقعات کا سبب بننے والے عوامل کا بھی مختصر ذکر کیا ہے۔ یہ رپورتاژ

بنیادی طور پر ۱۹۷۱ء کے حالات وواقعات کے براہِ راست مشاہدے پر مبنی نہیں بلکہ مصنفہ نے اس رپورتاژ میں حال سے ماضی کا مشاہدہ کیا ہے۔

ڈائری

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھی گئی ڈائریوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں۔ پہلی ڈائری مسعود مفتی کی ''لمحے'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی مگر اس سے پہلے یہ ڈائری ۱۹۷۶ء کے ماہ نامہ ''نقوش'' میں چھپ چکی تھی۔ دوسری ڈائری انور رضا کی تحریر کردہ ''یادوں کے جھروکے'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ انور رضا، ڈھاکہ میں متحدہ پاکستان کے آخری کمشنر، سیّد علمدار رضا کی بیگم ہیں، ابتلا کے ان دنوں میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ ڈھاکہ میں موجود تھیں، انھوں نے وہاں کے چشم دید واقعات اس ڈائری میں بیان کئے ہیں[۱۲]۔ تیسری ڈائری سید ضمیر جعفری نے ''جدائی کا موسم'' کے نام سے لکھی۔ یہ تینوں ڈائریاں چونکہ مختلف زاویۂ نگاہ اور ایک حد تک مختلف زمانی کینوس کی حامل ہیں۔ اس لئے ذیل میں ہم ان ڈائریوں کا الگ الگ جائزہ پیش کریں گے۔

مسعود مفتی کی ڈائری ''لمحے'' پیش لفظ کے علاوہ دو حصوں ''لمحوں کی رفتار'' اور ''لمحوں کی سوچ'' کے عنوانات میں تقسیم کی گئی ہے۔ ''لمحوں کی سوچ'' کے عنوان کے ساتھ ایک نوٹ بھی دیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈائری کا حصہ نہیں بلکہ ایک الگ مضمون ہے جو مصنف نے ۱۹۷۵ء میں ''شامِ ہمدرد'' کی تقریب میں ''قرآن روشنی ہے۔۔۔ تاریک دنوں میں'' کے عنوان سے پڑھا اور بعد ازاں اسے اس ڈائری میں شامل کر دیا۔ مصنف تاریک دنوں سے مشرقی پاکستان کے آخری دن مراد لیتے ہیں جب ہر طرف وحشت اور بربریت کا راج تھا اور وہ ان تاریک دنوں میں قرآن سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ''لمحوں کی سوچ'' کا غالب حصہ مصنف کی ۲۲ مئی کو لاہور سے ڈھاکہ روانی سے لے کر ۱۰ جون ۱۹۷۱ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مسعود مفتی نے پیش لفظ میں بتایا ہے کہ ''میں مئی ۱۹۷۱ء کو لاہور سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ قریباً اسی وقت سے ڈائری کا آغاز کیا اور سقوطِ ڈھاکہ تک یہ سلسلہ جاری رہا''[۳۲] مگر حقیقت میں سقوطِ ڈھاکہ سے چند دن پہلے جب مصنف کو دیگر ساتھیوں سمیت انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پناہ لینا پڑی تو انھوں نے ان دنوں کے واقعات ڈائری کی بجائے رپورتاژ کی صورت میں قلمبند کیے۔

فنی اعتبار سے بھی مسعود مفتی کی یہ ڈائری ان خصوصیات پر پورا اترتی ہے جو ڈائری کا خاصا شمار کی جاتی ہیں۔ انھوں نے پیش لفظ میں بطور صنف ڈائری کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ان کی تحریر کردہ ڈائری ان فنی خصوصیات پر پوری اترے۔ ڈائری کا آغاز ہفتہ ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کے اس دن سے ہوتا ہے جب مصنف لاہور سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے ان لوگوں کو جو ان کو الوداع

کہنے ائرپورٹ پر آئے تھے، کے تاثرات بیان کیے ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک مغربی پاکستانیوں کے دلوں میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے کیا کیا خدشات جنم لے چکے تھے۔

''یہ ہجوم اور یہ جذبات خالی خولی رسمِ الوداع سے ہٹ کر اس تشویش اور قلق کا اظہار تھے جو پوری قوم کو مشرقی پاکستان کے متعلق ہے۔ایئرپورٹ پر آنے والوں میں سے بہت کو یقین تھا کہ وہ مجھے آخری دفعہ دیکھ رہے ہیں اور شاید میرا وہاں سے زندہ واپس آنا ایک معجزہ ہوگا''۔۳۳؎

مسعود مفتی نے مشرقی پاکستان جا کر سیکرٹری تعلیم کے فرائض سنبھالے تو اردگرد کے حالات ان کے علم میں آنا شروع ہو گئے۔انھوں نے ان دنوں کے حالات تو بہ چشمِ خود دیکھے اور بیان کیے مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس سے پہلے رونما ہونے والے واقعات بھی مختلف لوگوں کی زبانی معلوم کیے اور اپنی ڈائری کا حصہ بنایا۔۲۵ مئی ۱۹۷۱ء کی ڈائری میں انھوں نے غیر بنگالیوں پر کیے جانے والے ظلم وستم کی نہایت بھیانک تصویر کشی کی ہے۔

''صوبائی عصبیت نے جس انداز میں ظلم کیے ہیں۔وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے کہیں آگے ہیں۔حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑے گئے،بچوں کو ماؤں کے ساتھ بدفعلی پر مجبور کیا گیا۔ایک کیپٹن کو ایک مجمع نے صرف مکوں،گھونسوں اور تھپڑوں سے مار ڈالا۔ایک اور آدمی کو قتل کرنے کے لیے اس کے دونوں ٹخنوں پر گولیاں ماری گئیں۔پھر دونوں گھٹنوں پر،پھر دونوں کندھوں پر اور پھر اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔کئی ہسپتالوں سے خبریں ہیں کہ وہاں غیر بنگالیوں کا سارا خون نلکی کے ذریعے نکال لیا گیا۔انسان یہ باتیں سن کر حیران رہ جاتا ہے''۔۳۴؎

اس ڈائری میں مسعود مفتی نے علاحدگی پسندوں کے حامی اخبار The People کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے کہ اس اخبار نے کس طرح علاحدگی پسندوں کا راستہ ہموار کیا۔ان کے خیال میں اس اخبار کے پرچے''آپس میں ملی ہوئی سیڑھیاں ہیں جن پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے بنگال نے علاحدگی کا مسلک اختیار کیا تھا''۔۳۵؎

انھوں نے اس بات کا بھی تجزیہ کیا ہے کہ ہمارے ملک کے بعض حلقے اب بھی اس بات پر بضد ہیں کہ مجیب الرحمٰن علاحدگی نہیں چاہتا تھا بلکہ محض اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔اس حوالے سے انھوں نے اخبار ''The People'' کے ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کے شمارے میں چھپنے والے بنگلہ دیش کے جھنڈے اور اس کے نیچے لکھی تحریر کا ذکر کیا ہے جس میں بنگلہ دیش کے جھنڈے کے بارے میں This is the flag for Independent Bangladesh. کے الفاظ درج ہیں۔مسعود مفتی نے اس اعلان کے باوجود بھی مجیب الرحمٰن کی

طرفداری کرنے والے عناصر کا ذکر سخت الفاظ میں کیا ہے۔

''کیا اس اعلان کے بعد بھی ۲۵ مارچ کا فوجی ایکشن غلط اور بے معنی کہا جاسکتا ہے؟ دنیا کی کس قوم نے کس زمانے میں اپنے کسی صوبے کے خلاف ایسے اعلانات کے بعد ایکشن نہیں لیا؟ دراصل ہماری قوم تاثرات کی ٹانگوں پر چلتی ہے اور نعروں کے شور پر اچھلتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے کوائف اکٹھے کر کے ان سے منطقی نتائج اخذ نہیں کرتی۔''۳۶

آگے چل کر انھوں نے ۲۳ اور ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء کے اخبارات میں چھپنے والے کالموں، اداریوں، کارٹونوں، اشتہارات، خبروں اور شہ سرخیوں کا حوالہ بھی دیا ہے جس سے علاحدگی پسند عناصر کے عزائم واضح نظر آتے ہیں۔

مسعود مفتی کی اس ڈائری کا سب سے اہم اور غالب حصہ ان مظالم کے تذکروں پر مشتمل ہے جو علاحدگی پسندوں نے غیر بنگالیوں پر روا رکھے۔ انھوں نے ان مظالم کا تذکرہ ان لوگوں کے حوالے سے کیا ہے جو ان مظالم کا شکار ہوئے۔ ان میں انجمن مہاجرین کے صدر دیوان وراثت علی اور دیگر متاثرین شامل ہیں۔

مئی ۱۹۷۱ء سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے کچھ عرصہ بعد کا دور نہایت ہولناک تھا۔ انسان انسان کا دشمن بن چکا تھا اور اس دشمنی میں درندوں کو بھی مات کر رہا تھا۔ اسلحہ ہر طرف موجود تھا اور انسانیت رخصت ہو چکی تھی۔ احمد رضا قصوری کے بقول:

''حالات کی خرابی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں عام لوگ بھی بم اور ہینڈ گرنیڈ یوں اپنی جیبوں میں لیے پھرتے تھے جیسے سگریٹ کے پیکٹ یا لولی پاپ لیے پھر رہے ہوں۔''۳۷

اِن حالات میں جب انسان کا ہاتھ روکنے والی کوئی دُنیاوی طاقت موجود نہ تھی، انسانوں نے انسانوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔

۲۸ مئی ۱۹۷۱ء اور اس کے بعد کے دنوں کی ڈائری زیادہ تر ان لوگوں کے بیانات پر مشتمل ہے جو ان مظالم کا شکار ہوئے۔ ذیل میں غیر بنگالیوں پر کیے جانے والے ظلم وستم اور اس دور میں کی جانے والی قتل وغارت گری سے متعلق چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جس سے نہ صرف اس دور کے حالات وواقعات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں بلکہ ان سے مصنف کے مؤثر اسلوب بیان کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''اس محلہ میں سبھی غیر بنگالی تھے۔ پہلے مردوں کو گولیوں سے قتل کیا گیا۔ پھر ان کی بیویوں، بہنوں اور ماؤں سے کہا گیا کہ ان کی قبریں کھودیں۔ اوپر سے بارش ہو رہی تھی اور مائیں اپنے بچوں کی قبریں کھود رہی تھیں۔ کسی کی آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ کسی کے بازو کاٹ دیے گئے

تھے، کسی کا سر غائب تھا اور اس سارے کام کی نگرانی مسلح لوگ کر رہے تھے۔'' ۳۸؎

''پھر وہ مردوں کو قتل کرنے لگے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل تو نہیں کیا مگر جیل کے کنویں میں پھینکتے گئے۔ پھر ان پر پٹرول ڈالا اور زندہ لوگوں کو آگ لگا دی۔ مردوں میں سے بھی بعض مرے نہیں تھے بلکہ گھائل پڑے تھے۔ جب وہ ذرا ہلے تو کمرے کی دیواروں پر اور فرش پر پٹرول ڈال کر آگ لگا دی۔'' ۳۹؎

''کئی لاشیں گڑھوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لاشوں پر گدھ منڈلا رہے تھے اور کتے کھا رہے تھے۔ بے شمار کھوپڑیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ میں نے کئی جگہ دیکھا کہ عورتوں کے ہاتھ مٹی میں سے باہر جھانک رہے تھے جن کی کلائیوں میں ابھی تک چوڑیاں پڑی تھیں۔'' ۴۰؎

مسعود مفتی مختلف لوگوں کی زبانی اس نوعیت کے واقعات ڈائری میں درج کرتے ہیں مگر وہ محض ان واقعات کو مجتمع کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان واقعات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ وہ قتل و غارت کے یہ واقعات دیکھتے ہیں تو اس کے سوتے اہل بنگال کی نفسیات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان فسادات کی جڑیں ۱۹۴۷ء اور صدر ایوب خان کے خلاف کیے جانے والے مظاہروں میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر تشویش میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں سب سے زیادہ بربریت کا مظاہرہ بنگال میں کیا گیا۔ ایوب خان کے خلاف کیے جانے والے مظاہروں میں بنگالی اور غیر بنگالی کی تقسیم کے بغیر ایک دوسرے کو درختوں کے تنوں پر میخوں سے گاڑ دیا گیا اور ۱۹۷۱ء کے فسادات پہلے کے واقعات کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے۔

''نفرت کے ابال میں قتل و غارت ہوتا آیا ہے اور قابلِ فہم بات ہے مگر قتل کرنے کے عمل میں ایک لذت حاصل کرنا قابلِ فہم نہیں۔ خصوصاً جب اس لذت کی خواہش کا اظہار ربع صدی میں تین موقعوں پر ہوا۔'' ۴۱؎

مسعود مفتی نے ایک ملاقات میں قتل و غارت میں لذت کے احساس کو بنگالیوں میں حسِ مزاح کی کمی قرار دیا ہے۔[۴۲] وہ جہاں بنگالیوں کی اس بربریت کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں وہ اہل بنگال کا دوسرا پہلو بھی پیش کرتے ہیں جو بربریت کے ان تذکروں میں چھپ جاتا ہے۔ وہ ان بدترین حالات میں ان انسانوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانیت کے چراغ ہمیں بدترین حالات میں بھی جلتے نظر آتے ہیں۔ ڈائری میں ایک شخص نثار احمد کا تفصیلی بیان قلمبند کیا گیا ہے جو اپنے لٹنے کی داستان سناتا نظر آتا ہے۔ اس داستان میں وہ نیک دل بنگالیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''کئی نیک دل بنگالی لوگ مسجد میں کھانے کی چیزیں بھجوا رہے تھے اور بنگالی امام مسجد بڑی

جانفشانی سے لٹے پٹے لوگوں کی خدمت کر رہا تھا۔ کئی بنگالی غنڈے وہاں بھی پہنچے اور امام مسجد کو دھمکایا کہ ان لوگوں کو مسجد سے باہر نکال دے مگر وہ نیک دل مسلمان تھا اس نے ہر بار انکار کر دیا۔''۴۳

اسی طرح مختلف لوگوں کے تاثرات سننے اور خود حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد مصنف جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔

''اس دورے میں جو باتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ میمن سنگھ میں بنگالیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو مغربی پاکستانیوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی۔ مشرقی پاکستان کا یہی المیہ ہے کہ یہاں پر شور اور بدنیت اقلیت کے سامنے وفادار اکثریت بے بس ہوئی ہے اور مغربی پاکستان والے سمجھتے ہیں کہ ساری بنگالی قوم ہمارے خلاف ہے حالانکہ یہ انتہائی غلط تاثر ہے۔''۴۴

مسعود مفتی نے ڈائری میں ان مہاجر کیمپوں کی صورتحال بھی بیان کی ہے جن کا مشاہدہ انھوں نے مختلف دوروں میں کیا۔ ان کیمپوں کا حال بیان کرتے وقت وہ صرف خارج میں موجود چیزوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کی آنکھوں میں چھپے درد کو بھی محسوس کرتے ہیں اور اسے ڈائری میں بیان کرتے ہیں۔

''انجمن کے اراکین سے بات چیت کے بعد ہم کیمپ میں گئے۔ بے چارگی اور کسمپرسی کی ایسی انتہا تھی کہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ ایک ایک کمرے میں پندرہ پندرہ، بیس بیس عورتیں، بچے اور مرد اپنے ناکافی لباس میں فرش پر بسیرا کیے ہوئے تھے۔ مگر ہم زیادہ گھوم نہ سکے کیونکہ عورتوں کی نظر میں سوال تھے مردوں کی آنکھوں میں طعنے تھے اور مجھے کچھ احساسِ گناہ سا ہونے لگا کہ ہم ان کی مصیبت کا تماشا دیکھنے آئے ہیں۔''۴۵

مسعود مفتی کی یہ ڈائری مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی روداد بیان کرتی ہے۔ انھوں نے اس ڈائری میں نہ صرف ذاتی مشاہدات بلکہ ظلم و ستم کا شکار ہونے والے لوگوں کی آپ بیتیاں بھی بیان کی ہیں۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کی مجموعی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے انفرادی سطح پر پیش آنے والے المیوں کا مؤثر انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر مقصودہ حسین ''لمحے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''کہنے کو یہ ڈائری ہے لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ جب اس کو قاری کھول کر بیٹھتا ہے تو اسے کہیں بھی ڈائری جیسی خشکی نہیں ملتی۔ ہر صفحے پر ایک حساس دل اور اردگرد ہونے والے حالات و واقعات کو بیان کرنے کے پیچھے ایک دردمند، حساس سوچ کا حامل اور پاکستانیت کے رنگ

میں ڈوبا ہوا تخلیق کار نظر آتا ہے۔ ہر تاریخ ایک روزنامچے کی بجائے بذاتِ خود ایک مکمل واردات محسوس ہوتی ہے جس میں جزئیات نگاری اور زبان و بیان کا افسوں اپنے تمام ادبی تقاضوں سمیت ملتا ہے۔''۴۶؎

مذکورہ پس منظر میں لکھی گئی دوسری ڈائری انور رضا کی ''یادوں کے جھروکے'' کے نام سے چھپی۔ فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ڈائری سے زیادہ روداد نظر آتی ہے۔ مسعود مفتی کے بقول ''اس کی ہیئت ڈائری کی نہیں مگر تاثر ڈائری کا ہے جس کی بنیادی خصوصیت اپنی ذات کے حوالے سے کوائف کا انتخاب کرنا ہے''۴۷؎ متحدہ پاکستان کے ڈھاکہ میں آخری کمشنر سید علمدار رضا کی بیگم ۱۹۵۵ء میں اپنے خاوند کے ہمراہ مشرقی پاکستان گئیں۔ بعدازاں بھی ان کے خاوند کی ملازمت کا زیادہ عرصہ مشرقی پاکستان میں گزرا تو یہ ان کے ہمراہ رہیں۔ انھوں نے اس ڈائری میں ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے لکھی گئی اکثر تحریروں میں مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کا تذکرہ ملتا ہے مگر انور رضا کی ڈائری کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کے واقعات، حالات اور مشاہدات کو اس ڈائری کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ دیکھا اسے بلاکم و کاست اس ڈائری میں بیان کر دیا۔ مصنفہ زمان و مکان کے لحاظ سے قاری کو اپنے ساتھ لیے پھرتی ہیں۔ گھروں کے اندر بنگالیوں کے رہن سہن سے متعارف کرواتی ہیں اور وہاں کے موسموں کا خوبصورت ادبی انداز میں تذکرہ کرتی ہیں تو قاری خود کو اس فضا کا حصہ محسوس کرتا ہے۔

''ابھی ابھی بارش ہو کر تھمی تھی مگر جھکے ہوئے گہرے سرمئی رنگ کے ابر پارے پھر موسلا دھار برسنے کو تیار نظر آ رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب قسم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی خوشبو جو قدرت نچھاور کر رہی ہو، جو پانی، مٹی اور سبزے کی اصل روح کا مرکب ہو، ایسی خوشبو جس کو کوئی نام نہ دیا جا سکے مگر جو اپنے طلسم کے حصار میں ذہن اور دماغ کو مقید کرے اور جو خوابوں کی دنیا کا پتہ دے۔''۴۸؎

چونکہ انور رضا کو قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہی مشرقی پاکستان کے حالات دیکھنے اور وہاں کے لوگوں سے قریبی ربط رکھنے کا موقع ملا، اس لیے انھوں نے اس زمانے کے حالات کو بھی ڈائری میں شامل کیا ہے۔ اس حصے کو پڑھ کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہت عرصے تک مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں کے لیے محبت کے جذبات موجود رہے مگر پھر رفتہ رفتہ حالات اس ڈگر پر چلنا شروع ہوئے جو نفرت کا باعث بنے۔ انھوں نے زبان کے حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل کا ارتقائی جائزہ پیش کیا ہے کہ کس طرح یہ مسئلہ آہستہ آہستہ بڑھا جس کا شروع میں نام و نشان تک نہ تھا۔

''ہمارے درمیان زبان کا مسئلہ کبھی دیوار نہ بنا اور زبان کی بنیاد پر ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہ ہوا حالانکہ ۱۹۵۲ء میں بنگالی زبان کی تحریک چل نکلی تھی اور شہدا کے خون سے سینچی بھی جا چکی تھی مگر یہ تحریک ابھی تک سیاسی سطح سے نیچے نہیں آئی تھی، انفرادی سطح پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، نہ تعلیم یافتہ طبقے پر اور نہ غیر تعلیم یافتہ افراد پر۔'' ۴۹

۱۹۵۲ء میں سیاسی سطح پر چلنے والی تحریک آہستہ آہستہ پھیلتی چلی گئی تو اس کا ایک سبب حکمرانوں کا بنگالیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک بھی تھا۔ انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ زبان کے مسئلے پر ان کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہے۔ حکومت نے اس بات کا احساس نہ کیا کہ وہاں کے لوگوں کو اپنی زبان سے کس قدر جذباتی وابستگی ہے۔ انور رضا اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

''بنگال میں رہ کر ملک کی ایک حقیقت اظہر من الشمس ہوئی اور وہ یہ کہ ہر بنگالی کو اپنی مادری زبان سے والہانہ عشق ہے۔ وہ اپنی زبان پر کسی دوسری زبان کی برتری کسی انداز سے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بنگال میں کامیاب زندگی گزارنے کا ایک ہی گُر ہے اور وہ یہ کہ بنگالی زبان پر عبور حاصل کر لو۔'' ۵۰

مگر افسوس کہ حکومت کے اربابِ اختیار اس بات کو نہ سمجھ سکے اور اپنی ضد پر اڑے رہے جس کا نتیجہ دونوں حصوں کے درمیان دُوریوں کی صورت میں سامنے آیا۔ غیر بنگالیوں نے خواہ وہ بہاری تھے یا مغربی پاکستانی، بنگلہ سیکھنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی تو وہاں کی آبادی بنگالی، بہاری اور پنجابی کے ناموں سے تین حصوں میں منقسم ہو گئی اور ان کے درمیان آہستہ آہستہ فاصلے بڑھتے چلے گئے۔

''جذباتی طور پر جو خلیج اردو اور بنگالی کے درمیان بنی وہ وسیع تر ہوتی گئی۔ میرے نزدیک اس کی دو ہی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ غیر بنگالی پاکستانیوں کا خود کو بنگالی زبان سے نابلد رکھنا یا مقامی زبان سیکھنے کی ضرورت کو اہمیت نہ دینا۔ دوسرے جذبات کی رو میں بہہ کر مقامی جبلتوں کو نظر انداز کر کے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے بنگالی پر ٹھونسنے کی اندھادھند کوشش۔'' ۵۱

لسانی تفرقے سے جنم لینے والی نفرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خلیج کے حوالے سے مصنفہ نہ صرف وہاں کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہیں بلکہ وہ اس کا دانشورانہ تجزیہ بھی پیش کر دیتی ہیں۔ وہ یہاں اس بات کا بھی تذکرہ کرتی ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایک طویل عرصے تک مشرقی پاکستانیوں کے دل نفرت سے پاک تھے اور وہاں رہنے والے مغربی پاکستانیوں کو بالکل احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ آنے والے تھوڑے عرصے میں دونوں حصوں کے لوگوں

کے درمیان اس قدر دوری جنم لے لے گی۔

''ہر فرد و بشر اپنا سا لگ رہا تھا۔ان کے چہروں پر نفرت اور مخالفت کا تو سایہ بھی نہ تھا۔۔۔کوئی انتہائی قنوطانہ فطرت کا انسان بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ ٹھیک چودہ برس کے بعد اس حسین ماحول میں خون کی ایسی ہولی کھیلی جائے گی کہ چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔نفرت اور تعصب کا عفریت اس طرح ناچے گا کہ انسانیت کی ہر قدر سرنگوں ہو جائے گی۔''۵۲

ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبات سے لبریز شروع ہونے والا سفر بہت جلد ایک نئی صورت اختیار کر گیا مگر اربابِ اختیار نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اور دشمن نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔قیامِ پاکستان سے پہلے ہی وہاں تعلیم کے شعبے پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اسی طرح برقرار رہا۔ ہندو اساتذہ کو اپنے نظریات اور خیالات نئے ذہنوں پر مسلط کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی اور وہ بھی اس کام سے کبھی غافل نہ رہے۔مصنفہ مشرقی پاکستان میں تعلیم کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''مشرقی پاکستان میں تعلیم مجموعی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔وہ ابتدا ہی سے ملک کی یک جہتی کی بنیادیں شاطرانداز میں کھرچ رہے تھے۔کئی تعلیمی اداروں میں بجائے قائداعظم کے، گاندھی اور نہرو کی تصاویر آویزاں ہوا کرتی تھیں۔بچوں کے نصاب کی کتابوں میں ایسے موضوع و تحریریں بھی شامل تھیں جو نظریہ پاکستان کے سراسر خلاف تھیں۔''۵۳

تعلیم کی طرح معیشت بھی مکمل طور پر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ایک بار مصنفہ کے خاوند کا تبادلہ سب ڈویژن چوآڈانگہ میں کر دیا گیا جو کلکتہ کی سرحد پر واقع ہے۔اس علاقے کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ بتاتی ہیں کہ اسے دیکھ کر اس بات کا تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دو الگ الگ ملک ہیں۔اس علاقے کے لوگوں کا دونوں ممالک میں آنا جانا اور کاروبار کی صورتحال یہ تھی کہ کوئی خاندان خود پاکستان میں رہ رہا تھا تو اس کے جانور بھارت میں کھڑے ہیں۔کسی کی رہائش بھارت کی حدود میں ہے تو پانی کی ضرورت پاکستان سے پوری کر رہا ہے۔مصنفہ اس علاقے کی معیشت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''وہاں کی معیشت مکمل طور پر ہندوؤں کے قبضے میں تھی۔ہندو مہاجن ،ہندو سرمایہ دار، ہندو تاجر اور ہندو ہی کاریگر۔مسلمانوں کی معیشت ہندوؤں کے تابع تھی یعنی وہ ہندوؤں کے کارندے تھے یا ان کے لیے کاروبار چلاتے تھے۔ماسوائے چند ایک معزز مسلمان گھرانوں کے تمام معززین شہر ہندو تھے۔''۵۴

اسی طرح ۱۹۵۷ء کے اوائل میں ان کے خاوند کا تبادلہ چوآڈانگہ سے مانک گنج ہو گیا تو مصنفہ نے وہاں کے

حالات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان کی جھلکیاں قاری کے سامنے پیش کیں۔

''عام انسان پر ہندو تہذیب اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ مسلمان برملا و بلا جھجک ''کالی مائی'' کی قسم کھاتے تھے۔ سب ڈویژن کی سماجی و معاشرتی زندگی پر ہندو تہذیب پوری طرح مسلط تھی۔'' ۵۵

۱۹۶۷ء میں مصنفہ کے خاوند کا تبادلہ مغربی پاکستان ہو گیا مگر انھیں اسی سال کسی سرکاری کام کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ انھوں نے اس عرصے میں وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور ایک خط میں اس کی عکاسی کی۔ سید علمدار رضا کا وہ خط بھی اس ڈائری میں شامل کیا گیا ہے۔ اس خط میں وہ بدلتے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وہ سیاسی طوفان جس کی لپیٹ میں ہمارے ملک کا یہ حصہ ۱۹۵۲ء میں آیا تھا۔ آج اپنے شباب پر ہے۔ اس کے لگائے ہوئے لسانی، معاشی، تمدنی اور معاشرتی پودے خاصے بڑے ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک نکھار اور توانائی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اس منظر پر حاوی ہیں۔'' ۵۶

۱۹۷۱ء میں سید علمدار رضا کا تبادلہ ایک بار پھر مشرقی پاکستان میں کر دیا گیا اور انھیں ڈھاکہ کا ڈپٹی کمشنر متعین کر دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارے مشرقی پاکستان میں فسادات برپا تھے اور ہر طرف غیر یقینی کی صورتحال تھی۔ مصنفہ مشرقی پاکستان کے ان آخری دنوں کی فضا کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''بے یقینی اور غیر اطمینانی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پراسرار قسم کے خطوط بمعہ کفن (چھوٹے سے لٹھے کے ٹکڑے کے ساتھ) بہت بڑھ چکے تھے۔ یہ خطوط مقامی بنگالی سرکاری ملازمین کو ہی بھیجے جاتے تھے اور مجھے معلوم ہے کہ جس روز جس کو بھی یہ خط ملتا اسے چند روز تک تو اپنے اردگرد موت منڈلاتی نظر آتی۔'' ۵۷

نومبر تک حالات مزید بگڑ چکے تھے اور قتل و غارت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ غیر بنگالیوں کو موقع ملتا تو وہ بنگالیوں کو ذبح کر دیتے اور بنگالیوں کو موقع ملتا تو وہ وحشیانہ مظالم ڈھاتے۔ مصنفہ کے بقول:

''یعنی انسان قطعی انسان نہیں رہا بلکہ اس علاقے میں بھوکے بھیڑیے بس رہے ہیں۔ کسی بنگالی اور بہاری کی تخصیص کے بغیر ہر انسان بھیڑیے کا کردار اپنائے ہوئے ہے۔۔۔ یہاں کی ارزاں ترین جنس انسانی زندگی ہے جس سے ہوس و حرص اور تعصب کا عفریت گلی کوچے میں کھیل رہا ہے۔'' ۵۸

انور رضا نے تاریخِ پاکستان کے ان سیاہ دنوں کی ڈائری تاریخوں کے اندراج کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس

سے نہ صرف مصنفہ کے ان دنوں کے بارے میں جذبات واحساسات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے بلکہ ملکی تاریخ کے اس اہم موڑ کو بھی لحہ بہ لحہ دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً وہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو منعقد ہونے والی تقریب کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

''یہ سن کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے، اپنی فوج کے افراد اپنی پوری آن بان کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگئے ۔۔۔آہ۔۔۔آہ۔۔۔آج ڈھاکہ میں بھارت کی فوجیں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوگئیں۔'' ۵۹

مجموعی طور پر سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی یہ ڈائری اپنے قاری کو اس سانحے کی طرف بڑھتے ہوئے حالات کی ارتقائی تصویر دکھاتی ہیں۔ مصنفہ نہ صرف تاریخ کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے قاری کو اصل صورتحال سے آگاہ کرتی ہیں بلکہ وہ مشرقی پاکستان کے موسموں، آب وہوا اور وہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور طرزِ فکر کے کئی ایک ایسے زاویوں سے بھی ہمیں آگاہ کرتی ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتے۔

''جدائی کا موسم'' سید ضمیر جعفری کی ڈائری ہے جس میں انھوں نے ۱۹۷۱ء کے حالات و واقعات قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے اس ڈائری کے آغاز میں تحریر کیا ہے کہ روزانہ ڈائری لکھنا، ۱۹۴۳ء سے ان کا معمول تھا، ان کی ان ڈائریوں کے کچھ حصے تو ہفت روزہ ''ہلال'' میں چھپتے رہے تاہم انھوں نے ۱۹۷۱ء کی ڈائری کو ''جدائی کا موسم'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس ڈائری کا آغاز یکم جنوری ۱۹۷۱ء اور اختتام ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء پر ہوتا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے کے سبب یہ سال ہماری تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس ڈائری کے ذریعے ہمیں سانحۂ مشرقی پاکستان کی لحہ بہ لحہ بگڑتی صورتِ حال، مجیب، بھٹو اور یحییٰ مذاکرات، سرحدوں کی صورتِ حال اور عوامی تاثرات سمیت کئی دیگر پہلوؤں سے اس المیے کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ سید ضمیر جعفری اپنے مخصوص انداز میں ان مذاکرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ڈھاکہ میں کل شام شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان ملاقات ہوئی۔ بات چیت ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ اندر کی بات اندر والے جانیں البتہ دونوں لیڈر جب باہر آئے تو خوش خوش نظر آئے۔ پوری قوم ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔'' ۶۰

سید ضمیر جعفری کی اس ڈائری میں مجیب، بھٹو اور یحییٰ خان کے مذاکرات کا تذکرہ مختصر مگر جامع انداز میں ملتا ہے۔ وہ چونکہ ایک صاحبِ طرز ادیب تھے اس لیے ان کے ہاں مختصر جملوں کے ذریعے صورتِ حال کی بہترین عکاسی کی

گئی ہے۔ ۹ فروری کی ڈائری کا ورق ملاحظہ فرمائیے۔

''اندرا گاندھی کی دھمکیاں شدید ہوتی جا رہی ہیں، دونوں بازوؤں میں فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ حالات دگرگوں ہیں۔۔۔۔۔۔ باہر بارش کی بوندا باندی ہے اور دل میں اداسی کی بوندا باندی۔'' ۶۱

اس دوران ۱۵ فروری کو ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کر دیا کہ ان کی پارٹی تین مارچ کے ڈھاکہ میں بلائے گئے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کرے گی۔ سید ضمیر جعفری نے اس دن کی ڈائری کو ''بدقسمتی'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس دن کی ڈائری ان کے داخلی کرب کی عکاسی کرتی ہے۔

''بھٹو کے اس اعلان سے ملک کا آئینی بحران گہرا ہو گیا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علیحدگی کے امکانات بڑھ گئے۔۔۔۔۔۔ جمہوری عمل رکتا نظر آتا ہے۔ ہم کسی بڑے سانحے کے قریب پہنچ گئے ہیں جس سے کوئی معجزہ ہی اب ہمیں بچا سکتا ہے۔'' ۶۲

عام طور پر لکھی جانے والی ڈائریوں میں صرف اہم واقعات درج کیے جاتے ہیں اور کسی خاص واقعے کی روداد بیان کی جاتی ہے مگر چونکہ سید ضمیر جعفری ہر روز ڈائری لکھا کرتے تھے اس لیے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس ڈائری کا حصہ ہیں۔ اس طرح اس ڈائری کے ذریعے یکم جنوری سے اکتیس دسمبر ۱۹۷۱ء تک کی ایک ایسی تصویر سامنے آجاتی ہے جس میں کہیں بھی خلا کا احساس نہیں ہوتا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کا بار بار التوا، مشرقی پاکستان کی ہڑتالیں، راہنماؤں کے بیانات، عالمی طاقتوں کا کردار اور بگاڑ کی طرف بڑھتے حالات کے ساتھ ساتھ ان حالات کے بارے میں مصنف کی آرا بھی اس ڈائری کا حصہ ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی کا آغاز کر دیا گیا اور ساتھ ہی ''عوامی لیگ'' کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا۔ ضمیر جعفری ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''صدر یحییٰ خان کا بیان سکتے میں لانے اور رونگٹے کھڑے کرنے والا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ نوبت کیوں کر آگئی۔ کیا یہ ہماری بے تدبیری اور بدقسمتی نہیں ہے۔ کیا مجیب الرحمان کو ہم دھکیلتے دھکیلتے دیوار تک نہیں لے گئے۔ کیا خانہ جنگی کے راستے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے میں صرف کہہ سکتا ہوں کہ دل سخت دردمند ہے۔'' ۶۳

مصنف کا خیال ہے کہ مغربی پاکستانی حکمرانوں کو مشرقی پاکستان میں طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ طاقت کے ذریعے کسی مسئلے کو وقتی طور پر تو دبایا جا سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ممکن نہیں۔ وہ اپنے مخصوص ادبی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ''قوت کے استعمال سے بیمار کے چہرے پر رونق آجائے تو آجائے، بیمار کبھی تندرست نہیں ہوتا۔'' ۶۴ مصنف وقت کے ساتھ ساتھ قاری کو دسمبر کے زمانے میں لے آتے ہیں جب

جنگ چھڑ چکی تھی۔ مشرقی محاذ سے اچھی خبریں نہیں آ رہی تھیں۔ قیامِ پاکستان سے اب تک یہی کہا جاتا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا مگر بدقسمتی سے مغربی پاکستان سے کوئی بھرپور حملہ نہیں کیا گیا جسے بہت سے لوگ بدنیتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ سید ضمیر جعفری بھی اس موقع پر مغربی پاکستان کی خاموشی پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ ''زبردست جنگ جاری ہے۔ تعجب ہے کہ مغربی پاکستان کے محاذ سے کوئی خاص خبر نہیں آ رہی اگرچہ فوجیں اگلے مورچوں پر تو موجود ہیں''۔[۶۵] ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کے دن لکھے گئے اس ڈائری کے صفحات جہاں ان دنوں کا حال بیان کرتے نظر آتے ہیں وہیں مصنف کے داخلی کرب کے بھی عکاس ہیں۔ ۱۵ دسمبر کی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

> ''لوگوں کے چہروں پر اداسی کے ایسے سائے ابھر رہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ ہماری ایک لاکھ سے زیادہ سپاہ موت کے منہ میں گھری ہوئی ہے۔ گورنر اور اعلیٰ حکام ہوٹل میں پناہ گزین ہیں۔ گورنر ہاؤس مسلسل بمباری کی زد میں ہے۔ تمام رابطے منقطع ہیں۔ صدر یحییٰ خان کل قوم سے خطاب کریں گے۔ دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں۔ خدایا روشنی! روشنی! روشنی!''[۶۶]

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن ہماری تاریخ میں وہ سیاہ باب رقم کر گیا جو تمام محبِ وطن پاکستانیوں کے لیے سوہانِ روح ہے۔ ہم نے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک جو بویا تھا، یہ اس کے کاٹنے کا دن تھا۔ سید ضمیر جعفری کی اس دن کی ڈائری ہر محبِ وطن پاکستانی کی آواز بن کر سامنے آتی ہے۔

> ''بھارت کی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں۔ مسجدیں خاموش ہو گئیں...... مشرقی پاکستان پر ایک نئے وطن ''بنگلہ دیش'' کا پرچم لہرا دیا گیا...... قائداعظم کے پاکستان کی سالمیت ختم ہو گئی...... آج کا دن ہماری تاریخ کا سیاہ دن ہے۔ اجتماعی اداسی کا اتنا بھیانک لمحہ ہم پر اس سے پہلے کبھی نہیں گزرا۔ ہمارے لیے یہ شکست کا پہلا تجربہ ہے۔ لفظ میرے قلم پر سوکھ گئے۔''[۶۷]

یہ ڈائری لکھتے وقت سید ضمیر جعفری کے سامنے سانحۂ مشرقی پاکستان کی داستان لکھنے کا مقصد نہ تھا بلکہ وہ حسبِ عادت کئی سالوں سے یہ ڈائری لکھ رہے تھے۔ اس دوران میں ۱۹۷۱ء کا سال آیا تو بھی ڈائری لکھنے کا یہ سلسلہ جاری تھا چنانچہ اس سال کی ڈائری میں دیگر واقعات کے ساتھ ساتھ سقوطِ مشرقی پاکستان کی داستان بھی سمٹ آتی ہے۔ اس ڈائری کے ذریعے انھوں نے جنوری سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک کے اکثر و بیشتر واقعات کا احاطہ کر دیا ہے، جس سے ارتقا پذیر ہوتے حالات کی ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھی گئی باقی ڈائریاں تو مشرقی پاکستان کے واقعات بیان کرتی ہیں جب کہ سید ضمیر جعفری کی اس ڈائری میں حالات و واقعات مغربی پاکستان میں موجود ایک شخص کی نگاہ سے دیکھے اور بیان کیے گئے ہیں۔

رُوداد

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی بعض تحریروں کو ادبی اصناف کے حوالے سے کوئی نام دینا قدرے محال ہے۔ خصوصاً ان ادیبوں کی تحریریں کو جنھوں نے اس واقعے کو خود دیکھا اور اپنے تاثرات قلمبند کیے۔ ان تاثرات یا ان واقعات کی تصاویر پر مبنی یہ تحریریں کسی بھی صنف کی تعریف پر مکمل پورا نہیں اترتیں۔ مگر مسعود مفتی کے بقول ''شہادت کی اہمیت اس کے اسلوب میں نہیں بلکہ اس کی صداقت اور خلوص میں ہوتی ہے اور جہاں جہاں خلوص اور سچائی ہو وہاں نئے اصنافِ ادب اور نئے اسلوب بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔''[۶۸]

خلوص اور سچائی کی شہادت پر مبنی تحریروں میں صدیق سالک کی کتب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اور ''ہمہ یاراں دوزخ'' بھی شامل ہیں۔ جنھیں پروفیسر فروغ احمد نے روداد کے زمرے میں شمار کیا ہے[۶۹]۔ صدیق سالک نے ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کو پہلے انگریزی میں ''Witness to Surrender'' کے نام سے لکھا، بعد ازاں انھی حالات و واقعات پر مبنی روداد کو ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' کے نام سے شائع کیا۔ اس روداد میں ان کی راولپنڈی سے ڈھاکہ روانگی سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کی مکمل کہانی بیان کی گئی ہے جب کہ دوسری کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' میں وہ ڈھاکہ سے بھارت کی قید اور پھر قید سے رہائی کے بعد لاہور آمد تک کے واقعات کو مفصل انداز میں بیان کرتے ہیں۔

صدیق سالک کی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' تین ابواب ''سیاسی افق''، ''خانہ جنگی'' اور ''جنگ'' میں تقسیم کی گئی ہے۔ کتاب میں بیان کیے گئے واقعات کا آغاز جنوری ۱۹۷۰ء اور خاتمہ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کے اس دن کے تذکرے پر ہوتا ہے جب مصنف کو باقی ساتھیوں سمیت بھارت کی قید میں روانہ کر دیا گیا۔ یہ کتاب سقوطِ ڈھاکہ کے پسِ منظر اور منظر کو جاننے کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انھوں نے اس سانحے کے اسباب و علل کا بغور جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے جغرافیائی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور لسانی پہلوؤں سے حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ ایک مقام پر بنگالیوں کی غربت کی تصویر کشی اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہاں کی معاشی صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔

> ''راستے میں افلاس اور ناداری کے ایسے ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ ملازمت کے لیے ماری ماری پھرتی آیاؤں کی بے چینی سمجھ میں آ گئی۔ راستے میں جو عورتیں نظر آئیں ان کے پاس ستر پوشی کے لیے چند چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مرد دکھائی دیے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ تھے۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے

انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔''۷۰

اسی طرح ایک اور مقام پر انھوں نے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے زمانے تک وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ خود کو مغربی پاکستان سے علاحدہ تصور کرنے لگ چکا تھا۔

''ذہنی اور فکری محاذ پر بھی کیفیت تشویشناک تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں میں جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا وہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکہ شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ میری خواہش پر مجھے سنٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔۔۔۔ لائبریری کے اس چکر میں وہ ایک جگہ اور رکے اور شیلف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ''یہ سارا شیلف تمھارے قائداعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔'' زور ''تمھارے'' پر تھا جس کی چبھن مجھے محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔''۷۱

اسی طرح تدریسی اور لسانی حوالوں سے بھی انھوں نے صورتحال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ''مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا یہ خلیج پاٹی جا سکے گی یا اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا۔''۷۲ آگے چل کر انھوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والی صورتحال قاری کے سامنے پیش کی ہے۔ انھوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۰ء کے آپریشن سرچ لائٹ، جنرل نیازی کی ڈھاکہ آمد، مکتی باہنی کی کاروائیوں، ٹکا خان کی ڈھاکہ سے واپسی، سیاسی میدان میں ہونے والی تبدیلیوں، جنگ کا مفصل ذکر اور آخر پر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈالے جانے کی تقریب کے احوال پر مشتمل تمام حالات و واقعات کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔

صدیق سالک کی دوسری کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' دراصل پہلی کتاب کا ہی تسلسل ہے۔ اس کتاب میں مذکور حالات کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے کہ جن پر پہلی کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے بعد دیگر فوجی افسران کے ساتھ صدیق سالک بھی بھارتی قید میں چلے گئے۔ اس کتاب میں انھوں نے انھی تجربات، محسوسات اور مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ قید کے دوران ان کے دل و دماغ کے بہت سے نئے دریچے کھلے اور انھوں نے مختلف معاملات کو کئی زاویوں سے دیکھا اور انھیں قاری کے سامنے بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جب بھی کوئی ستمگر کوئی نئی بنائے ستم رکھتا، سوچ کا ایک نیا افق ابھرتا۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا سرمایۂ حیات بڑھتا گیا حتیٰ کہ دو سال بعد جب واہگہ پہنچا تو میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی طرح تہی دامن نہ تھا۔ اب میرے کیسۂ دل میں قیمتی موتی اور دامنِ خیال میں انمول گوہر تھے۔ میں نے انہی موتیوں اور گوہروں کو اس کتاب میں پرونے کی کوشش

کی ہے۔''۳؎

صدیق سالک نے اس کتاب کو بیس عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عنوان ''شمشیر سے زنجیر تک'' کے نام سے ہے جس میں وہ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کا ذکر کرتے ہیں جب کہ آخری عنوان ''دو مینار'' کے نام سے ہے جس میں وہ ڈھاکہ کی جامع مسجد اور لاہور کی بادشاہی مسجد کے میناروں کو دیکھ کر ان کے درمیان مشترک ماضی اور مشترک مستقبل کی جھلک محسوس کرتے ہیں۔ کتاب کا غالب حصہ قید کے دوران بھارتی حکومت کے رویوں اور ان کے مختلف ہتھکنڈوں کے ساتھ ساتھ قیدیوں کی نفسیات کے خوبصورت ادبی اسلوب میں تذکرے پر مشتمل ہے۔ ''حدیث دیگراں'' کے عنوان سے انھوں نے دیگر قیدیوں کے تجربات بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں صدیق سالک نے مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کا ذکر کیا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے محب وطن پاکستانیوں کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔

> ''ڈھاکہ چھاؤنی میں یہ خبر یاس والم کا پیغام بن کر آئی۔ جذبۂ جہاد سے سرشار چہرے یک لخت بجھ گئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں، جگر پارہ پارہ اور دل فگار ہو گئے ۔۔۔ یہ ماتم، آہ وفغاں اور گریہ وزاری سپاہیانہ شان کے شایان نہ سہی، لیکن جواں مرگ پر کس کا کلیجہ منہ کو نہیں آتا۔ آج چوبیس سالہ پاکستان کا عین عالم شباب میں آدھا دھڑ کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا۔''۴؎

آگے چل کر وہ سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد کے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہیں جب علاقائی تعصب کی بنا پر مسلمان، مسلمان کا دشمن بن چکا تھا اور اس کی درندگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

> ''گردوپیش میں بہت کچھ دیدنی تھا۔ خونِ مسلم کی ارزانی، اسیروں کا سوزِ نہانی، پناہ گزینوں کی خانہ ویرانی اور فاتحین کی شادمانی ۔۔۔ لیکن ذوقِ تماشا نے ساتھ چھوڑ دیا۔ گزشتہ دو تین روز سے جو کچھ دیکھا اور سن چکا تھا اس کے بعد مزید سننے اور دیکھنے کی سکت نہ رہی۔''۵؎

صدیق سالک نے اس واقعاتی روداد میں حالات کی تلخی کو بیان کرنے کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ گویا دل کے جذبات کو قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ قیدی کے لیے دن اور رات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور وقت تھم جاتا ہے۔ ایک مقام پر وہ ایک قیدی کے لیے رات کے خاتمے اور سورج کے طلوع ہونے کے احساس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''گردشِ ارضی نے بالآخر عروسِ شب کو الوداع کہا اور سپیدۂ سحر تمازتِ آفتاب سے کافور ہونے لگا لیکن طلوعِ آفتاب کے باوجود میری شبِ تاریک سحر نہ ہوئی۔ میرے لیے ہوا اور روشنی پر وہی قدغن رہی جو رات بھر سے تھی۔ میں لاچار و بے بس سیل میں بیٹھا اپنے ہی خیالات کے

بوجھ تلے پستار ہااور ہر لمحے خونِ دل رستار ہا۔'' ۶ے

بھارتی حکومت نے اس قید کے دوران جہاں قیدیوں کو جسمانی اذیت پہنچائی وہاں ان کے ذہنوں کو بدلنے کے لیے کئی نفسیاتی حربے بھی استعمال کیے۔ان کی پوری کوشش تھی کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ پاکستانی اور بھارتی ایک ہی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔وہ یہ باور کرانے میں بھی کوشاں رہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد دو قومی نظریہ باطل ہو چکا ہے۔

''کلکتہ میں میرے محتسب کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ بنگلہ دیش بننے سے نقشہ ہی بدل گیا ہے۔بھارت سے محاذ آرائی تو درکنار پاکستان کے لیے اپنا وجود قائم رکھنا بھی مشکل ہوگیا ہے تم تو قیدِ تنہائی میں ہو، ذرا باہر کی خبریں سنو تو حیران رہ جاؤ کہ دو قومی نظریہ دم توڑ چکا ہے اور پاکستان کے باقی صوبوں میں بھی علیحدگی کی تحریکیں زور پکڑ گئی ہیں۔'' ۷ے

قید کے سخت دن گزرنے کے بعد مصنف دوسرے قیدیوں کے ہمراہ ۱۶اکتوبر ۱۹۷۳ء کو وطن واپس پہنچے۔اس خوشی کے موقع پر انھیں خبر ملتی ہے کہ ان کی والدہ ان کے آنے سے چند روز پہلے انتقال کر چکی ہیں۔صدیق سالک خوشی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔

''مجھے یوں لگا کہ ارض وسما چکرا گئے ہیں۔سلسلۂ کائنات میں خلل پڑ گیا ہے۔اس تیز گرد بار میں، میں ایک ادنیٰ اور بے بس ذرے کی طرح تھپیڑے کھا رہا ہوں۔طوفان ذرا تھما تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے جیل سے نکال کر عمر بھر کی قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا ہے۔'' ۸ے

کتاب کے آخر پر قومی حوالے سے تمام مایوسیوں کے باوجود مصنف قاری کے دل میں اس بات کی امید پیدا کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمان متحدہ ہو جائیں گے۔وہ ڈھاکہ کی جامع مسجد اور لاہور کی بادشاہی مسجد کے میناروں کے درمیان ایک ایسے رشتے کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جس کی بنیاد پر مسلمان ماضی میں بھی ایک قوم تھے اور مستقبل میں بھی اخوت اور یگانگت کے رشتوں میں پروئے جائیں گے۔

''اس تیرہ و تار سفر میں مجھے روشنی کے صرف دو سرچشمے دکھائی دیتے ہیں جو اپنی جگہ سربلند لیکن ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔یہ ہیں ڈھاکہ کی جامع مسجد اور بادشاہی مسجد لاہور کے مینار۔جن کے درمیان اب ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ مجھے یہ دونوں مینار روشن اور بے داغ نظر آتے ہیں۔ان دونوں میناروں کا نہ صرف ماضی مشترک ہے بلکہ ان کا مستقبل بھی ایک ہے۔'' ۹ے

صدیق سالک نے ان دونوں کتابوں میں سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کے حالات، سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے کے

اسباب وعلل اور بعدازاں قید کے تلخ تجربے کے حالات وواقعات کو دلکش ادبی پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔

کرنل سید مقبول حسین کی ''کیمپ ۴۵'' بھی سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی روداد ہے۔ کرنل (ر) سید مقبول حسین سقوطِ ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان میں سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ نہ صرف ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا بلکہ یہ سانحہ ان کے دل ودماغ پر بھی گزرا۔ وہ ہتھیار ڈالنے کے بعد دیگر پاکستانی فوجیوں کے ساتھ ہندوستان کی قید میں چلے گئے اور پھر پاکستان بھارت معاہدے کے تحت رہا ہوئے۔ سید مقبول حسین نے قید کے ان دنوں کا مفصل حال اس روداد میں بیان کر دیا ہے۔ ان کی یہ روداد صرف ان کی ذات کے گرد نہیں گھومتی بلکہ انھوں نے اس میں پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''کیمپ ۴۵'' ۱۹۷۱ کے تناظر میں لکھی گئی کہانی ہے۔ اس میں خود میں بھی موجود ہوں۔ میرے دوست اور اس وقت کے فوجی افسر اور جوان بھی، حکمران اور سیاست دان بھی اور سب سے بڑھ کر عوام کی سیاسی اور سماجی چھاپ بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یہ کہانی سچائی سے بھرپور واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ تکلیف بھرے حالات ہیں جن کو میں نے ''شوگر کوٹ'' کرنے کی کوشش نہیں کی، جیسا محسوس کیا ویسا ہی بیان کر دیا۔'' ۸۰؎

مصنف نے اپنی اس روداد کو اڑتیس عنوانات میں تقسیم کیا ہے، ان عنوانات کے تحت جہاں انھوں نے جنگ کے دنوں کی بکھری یادوں کو سمیٹا ہے وہاں کیمپ کی روح فرسا زندگی کی بھی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ کرنل سید مقبول حسین نہ صرف حالات وواقعات کا خارجی روپ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں بلکہ وہ ان حالات کے پس منظر میں جھانک کر ان کا تجزیہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔

> ''جنگ کی یہ مختصر یاداشتیں ہمارے لیے سوہانِ روح تھیں۔ پاک فوج اگرچہ مشرقی پاکستان میں قابلِ قدر کارکردگی نہ دکھا سکی مگر ان حالات میں دنیا کی بہتر افواج بھی یہاں پاؤں جما کر نہ لڑ سکتیں۔ ہماری فوج سیاست کی بساط پر الٹ گئی تھی اور یوں اس کی عسکری خوبیاں سیاست کے کھیل میں دب کر رہ گئیں۔'' ۸۱؎

ان دنوں میں قیدیوں کے لیے خط بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ گھر کی خبر قید کے ان دنوں میں ہوا کا جھونکا بن کر داخل ہوتی۔ سید مقبول حسین اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''جب بھی پاکستان سے خط آتا تو اسے بار بار پڑھتا۔ خود کلامی ہوتی۔ کیمپ کی تھکی ہوئی فضا میں خوش رنگ جذبوں کی مہک محسوس ہوتی تو ذہنی سکون حاصل ہوتا۔'' ۸۲؎

کرنل سید مقبول حسین ایک محبِ وطن پاکستانی ہیں۔ بھارت کی قید سے رہا ہو کر پاکستان آ گئے مگر یہاں کے

حالات سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے۔ اس روداد کے آخری حصے میں انھوں نے پاکستان کے حالات کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے جو ان کے اندر کے اس کرب کو ظاہر کر رہا ہے جو یہاں کے حالات دیکھ کر ہر محب وطن پاکستانی کے دل میں جنم لیتا ہے۔

''مضبوط پاکستان کا خواب حقیقت کا روپ نہیں دھار سکا۔۔ مجھے ایسی امید کی کوئی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی۔ آج جب میں عمر کے اس حصے میں کھڑا ہوں تو بچے کھچے پاکستان کا منظر نامہ مجھے کرپشن اور بے یقینی کی دھند میں لپٹا نظر آ رہا ہے۔''۸۳؎

پروفیسر فتح محمد ملک، اس روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''یہ سرگزشت فقط کہانیاں ہی بیان نہیں کرتی بلکہ ان کہانیوں سے برآمد ہونے والے نتائج سے پاکستان میں قومی احساس کے زوال کے اسباب کا کھوج بھی لگاتی ہیں۔''۸۴؎

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاک فوج کے کئی افسروں نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اپنی کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ انھیں افسروں میں ایک کیپٹن نور احمد قائم خانی بھی تھے، جو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان میں فوج کا حصہ تھے اور پھر اس سانحے کے بعد باقی لوگوں کے ساتھ بھارتی قید میں چلے گئے۔ بعدازاں یہ اپنے کچھ ساتھیوں سمیت بھارتی قید سے فرار ہوئے اور طویل تگ و دو کے بعد مغربی پاکستان پہنچے۔ انھوں نے ان دنوں کی داستان، ماہ نامہ ''حکایت'' میں قسط وار لکھی جسے بعد میں ''فتح گڑھ سے فرار'' کے نام سے چھاپ دیا گیا۔ اس نوع کی کہانیاں گو کہ ادبی حوالے سے کسی بلند مقام و مرتبے کی حامل نہیں ہوتیں تاہم پاکستان سے محبت کا جذبہ ان میں واضح جھلکتا نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس روداد میں جہاں فرار کے ان دنوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے وہاں کئی دیگر پہلوؤں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میں مشرقی پاکستان میں ان دنوں پہنچا تھا جب عام انتخابات کے لیے زور و شور سے تیاریاں اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہنگامے اور عصبیت مشرقی پاکستان کے سنہرے پن کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ ڈھاکہ شہر کا سکون تہہ و بالا ہو چکا تھا۔ سیاسی ہلڑ بازی نے روزمرہ کی زندگی کو بری طرح سے متاثر کر رکھا تھا۔''۸۵؎

سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ جہاں قومی سطح پر ایک عظیم المیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہیں اس سانحے نے انفرادی سطح پر افراد کی زندگیوں کو بھی بے پناہ متاثر کیا۔ قتل و غارت گری کے اس دور میں نہ کسی کی عزت محفوظ تھی نہ کسی کی جان۔ اس المیے نے انسانوں کو نجی اور انفرادی سطح پر جس قدر متاثر کیا۔ اس کا احوال انسان اور انسانیت کے سارے بھرم کھول کر رکھ دیتا ہے۔ مصنف سقوطِ ڈھاکہ کے المیے کے اس پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے کتنے لوگ خانماں برباد ہوئے ہیں؟ کتنے اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے ہیں؟ کتنے بچے یتیم ہو گئے ہیں؟۔۔۔۔۔۔ یہ ایک لمبی اور درد بھری داستان ہے جو ایک سانحہ ہے، ایک المیہ ہے، ایک قیامت ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔'' ۸۶

سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے عام طور پر یہی بات بیان کی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے تمام لوگ، مغربی پاکستانیوں کے خلاف ہو چکے تھے اور وہاں کی تمام تر آبادی مغربی پاکستان سے علاحدگی کی خواہش مند تھی۔ یہ بات مکمل طور پر درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آخری لمحات تک بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کی سالمیت کی حامی تھی اور اس کے لیے کوشاں رہی مگر بدقسمتی سے مغربی پاکستانی حکمرانوں نے ان لوگوں کو نظر انداز کیا۔ کیپٹن نور احمد قائم خانی، اس روداد میں اس عام غلط فہمی کا شکار نظر نہیں آتے بلکہ وہ تاریخ کے ان لمحات میں بنگالیوں کے باطن میں اتر کر، ان کے دلی جذبات کو قاری پر عیاں کرتے ہیں تو اس بنگالی کی نمائندگی بھی ہو جاتی ہے جو پاکستان کی سالمیت کا خواہش مند تھا۔

''رات کو تقریباً دس بجے ہم آسام جاتے ہوئے سلہٹ شہر سے گزر رہے تھے تو لوگ بہت خاموشی سے ہمیں دیکھ رہے تھے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ یہ تاثرات ان کے چہروں سے صاف عیاں تھے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے وہ بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔'' ۸۷

مصنف نے اس موقع پر بوڑھے بنگالی کے دل کے جذبات بھی بیان کیے ہیں جو حالات کے جبر کا شکار بن چکا ہے اور سقوطِ ڈھاکہ کے بعد نئے آقاؤں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے مگر اس کے دل کی کیفیت کچھ اور ہے۔

''بوڑھا یہ واقعات سناتے ہوئے رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ''صاحب ہم نے پاکستان کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور آج بدقسمتی سے اسے ٹکڑے ہوتے بھی دیکھ لیا، کاش اس سے پہلے مجھے موت آ جاتی'' وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا ''سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دو تین بار کھانا زہر مار کیا ہے ورنہ چولہے میں آگ تک نہیں جلتی۔ میں اور میری بیوی راتوں کو روتے رہتے ہیں۔'' ۸۸

پاکستان اور پاکستانیت کے جذبے سے سرشار اس نوع کی رودادیں ادبی حوالے سے اگر بلند مقام پر فائز نہ بھی ہو سکیں تو ان کی یہ حیثیت بہر طور مسلمہ ہے کہ ان داستانوں کے ذریعے ہماری تاریخ کے اس سیاہ باب کے کئی ایک ایسے گوشے بھی واضح ہو جاتے ہیں جو عام طور پر مصلحت کی دھند میں چھپے رہ جاتے ہیں۔

ناولٹ

سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناولٹ کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تاہم اس پس منظر میں ام عمارہ اور غلام محمد نے دو عمدہ ناولٹ تحریر کیے ہیں۔ امِ عمارہ کا ناولٹ ''کونین میں اندھیرا'' دو حصوں میں ماہ نامہ ''فنون'' بھی شائع ہوا جب کہ غلام محمد کا ناولٹ ''لہو قطرہ قطرہ'' ان کی وفات کے بعد ۲۰۰۱ء میں چھپنے والے ان کے افسانوی مجموعے میں شامل ہوا۔

ام عمارہ کے ناولٹ ''کونین میں اندھیرا'' میں مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ناولٹ کی فضا ۱۹۷۱ء کے زمانے کے تعلیمی اداروں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ مصنفہ ایڈن گرلز کالج کے حالات وواقعات کے ذریعے پورے مشرقی پاکستان کے حالات کا تذکرہ کرتی ہیں اور خصوصاً اردو اور بہاریوں کے حوالے سے بنگالیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ ناولٹ کا مرکزی کردار عمارہ، جو ایک کالج میں لیکچرر ہے، اسے ایک دن باتوں باتوں میں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ بنگالی نہیں، بہاری ہے۔ کالج کی ایک لیکچرر شیریں آپا جب اس سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ سلہٹ میں گھر ہو جانے سے کوئی بنگالی نہیں ہو جاتا تو بہاری لیکچرر کانپ اٹھتی ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بھی بنگال کی مٹی نے انھیں قبول نہیں کیا۔

> ''اور اسی روز میں نے پہلی بار عقل کے ہاتھوں مجبور ہو کے سوچا کہ ہمارے اچھے دن رخصت ہو گئے اور وہ معمولی سا رخنہ جو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں محسوس کیا تھا، بڑھتا چلا آ رہا ہے اور میری اپنی خوش فہمی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری یکجہتی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ ہم اپنی پہچان کھو دیں گے اور دیس کی مٹی میں سما جائیں گے، اچانک ہوا ہو گئی۔''۸۹؎

اسی طرح ایک دن انگلش کی لیکچرر عائشہ ان کے کلاس روم پر قبضہ کر لیتی ہے تو انھیں بہت برا لگتا ہے۔ اس موقع پر بھی انھیں احساس دلایا جاتا ہے کہ اس سرزمین پر اردو اور بہاری دونوں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اب یہاں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

> ''اس طرح تو آپ ہماری کلاس کو اس کے اپنے کمرے میں اجنبی بنا دیں گی۔''
>
> ''میں کیا اجنبی بنا دوں گی عمارہ بی بی، یہ تو حالات ہی ایسے ہیں۔'' عائشہ آپا نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔
>
> ''ہم بھی چلتے ہیں۔ آج کا کلاس تو بس ایسے ہی گیا'' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔'' یہ

لڑکیاں بھی کیا سوچتی ہوں گی۔''

''کچھ بھی نہیں، صرف تمھارے ساتھ ان کی نفرت ذرا اور گہری ہو جائے گی۔'' عائشہ ہنسی، مگر کیوں؟

''وہ اس لیے کہ ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے یا یوں سمجھو کہ بدل دیا گیا ہے اور تمھاری اچھی بات بھی ان کے ذہن میں تیر ہی بن کے لگے گی کہ یہ بہاری ہیں اس لیے۔'' ۹۰

ناولٹ کا مرکزی کردار عمارہ انسانیت کے مذہب پر یقین رکھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تمام لوگ انسان ہونے کے ناطے ایک رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ ان میں سموئی ہوئی ارواح علاقوں اور نسلوں کی تفریق سے آشنا نہیں تو انسان نے خود کو کیوں کر ان خانوں میں بانٹ لیا۔

''میں نے تو آج تک کبھی یہ بھی سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ زندگی کا حسن کیا ہے اور روح کی حقیقت کیا ہے یا بنگالی روح الگ ہوتی ہے اور بہاری الگ یا بنگالیوں کا خون اتم ہوتا ہے اور غیر بنگالی اچھوت ہوتے ہیں اور ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔'' ۹۱

مگر اس کی یہ سوچ بنگال کی تعصب بھری فضا میں بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں مقیم ساری آبادی بنگالی اور مغربی پاکستانی یا مغربی پاکستان کے حامیوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی میدان میں جو زیادتیاں مغربی پاکستانی حکمرانوں سے سرزد ہوتیں وہ بھی وہاں مقیم عام مغربی پاکستانیوں کے حصے میں ڈال دی جاتیں اور انھیں اس کا ذمہ دار قرار دے دیا جاتا۔

''اس دن امینہ آپا اس طرح الجھ الجھ کے گفتگو کر رہی تھیں جیسے قومی اسمبلی کے ملتوی ہونے کا اعلان جنرل یحیٰ نے نہیں، میں نے کیا ہے اور بہاری ہونے کے ناطے جیسے بھٹو صاحب کے قول و فعل کی ذمہ داری مجھ پر آتی ہے اور میں سکتے کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایڈن گرلز کالج کے جانے پہچانے چہرے دسہرے کے بھوت نظر آنے لگے ہیں۔'' ۹۲

اس طرزِ سوچ کا نتیجہ دونوں حصوں کی علاحدگی اور وہاں اپنی جڑیں پیوست کرنے کے خواہش مند لوگوں کی ہجرت کی صورت میں سامنے آیا۔ ناولٹ کا مرکزی کردار عمارہ ہجرت کر کے لاہور آ جاتی ہے اور تین سال بعد ٹیلی ویژن پر بنگلہ دیش کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دیکھ کر اس سوچ میں گم ہو جاتی ہے کہ ۱۹۷۱ء کے زمانے میں لی گئی آزادی نے اہلِ بنگال کو کیا دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس آزادی کے نتیجے میں بھی انسان کی جھولی شکھوں سے خالی رہی اور وہ انسان جو مدتوں سے آرام و سکون کے لیے طرح طرح کی قربانیاں دیتا چلا آ رہا ہے خالی ہاتھ رہا۔

''ابھی ابھی پاکستان ٹیلی ویژن سے ایک ڈاکومنٹری دکھائی گئی ہے اور میں سوچ چلی جا رہی ہوں، یہ سڑکیں ڈھاکہ کی ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہاں تو خوشحالی ہوگی، زندگی کا ولولہ ہوگا اور محسنہ کی سوچ ہماری طرح دکھوں کی آماجگاہ نہیں ہوگی ۔۔۔ خاک وخون، سازش اور دھوکے کے پھندے سے نکل آنے والا دیش تو ان کے خوابوں کی دُنیا ہوگا اور اب یہ فلم دکھائی گئی ۔۔۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگتی ہیں۔'' ۹۳

مشرقی پاکستان کے حوالے سے لکھا گیا دوسرا ناولٹ غلام محمد کا ''لہو قطرہ قطرہ'' کے نام سے چھپا۔ زمانی اعتبار سے تو یہ ناول سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کے حالات بیان کرتا ہے مگر آغاز میں طویل تاریخی پس منظر کے طور پر آریائی تہذیب سے لے کر برصغیر پر انگریزوں کے قبضے تک کے واقعات کی طرف مختصر اشارے کر کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہماری تاریخ کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اور ہم کہاں سے چلے تھے؟ ناولٹ میں قیامِ بنگلہ دیش کے فوری بعد کے حالات اور مسائل کے ذکر کے علاوہ بہاریوں کے مسئلے کو بھی مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش کا نظم ونسق بھارتی فوج نے سنبھال لیا اور وہاں بڑے پیمانے پر لوٹ مار شروع کر دی تو بنگالیوں نے اس چیز کو سخت ناپسند کیا اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ مغربی پاکستانیوں کے جانے کے بعد بھارتیوں کے محکوم بن کر رہ گئے ہیں۔

''نئی مملکت کے مسائل بے شمار تھے۔ چھاؤنیوں سے پاکستانی فوجیں رخصت ہو چکی تھیں وہاں بھارت کی فوجوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا تاکہ نظم ونسق کی ازسرِ نو تعمیر میں وہ اربابِ حل وعقد کے ہاتھ بٹا سکیں۔ لوگوں نے اس کا جائزہ نہایت متعصب طور پر لیا اور کھلے بندوں یہ کہنے سے دریغ نہ کیا کہ پاکستانی گئے اور بھارتی آئے۔ جیسے جلتے سے چھلانگ لگائی تھی اور آگ میں گر پڑے۔'' ۹۴

متحدہ پاکستان کے ٹوٹنے کے عمل میں یوں تو کئی عوامل کارفرما رہے مگر دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے نے مشرقی پاکستانیوں کو اپنے اقتدار کے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہوئے ان سے جان چھڑائی۔ مسعود مفتی کے بقول:

''مشرقی پاکستان ہم سے علاحدہ نہیں ہوا۔ یہ تو ہمارے جاگیرداروں اور مغربی پاکستان کے فوجی افسروں نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ لوگ ہمارے لیے خطرہ ہیں چنانچہ مشرقی پاکستان سے جان چھڑا لینی چاہیے۔'' ۹۵

غلام محمد اپنے ناولٹ میں اسی حوالے سے تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غداری کا الزام اس پر کیسے لگا جس نے جمہوری طریقے پر انتخابات کے بعد اقتدار طلب کیا تھا؟ سازش حقیقتاً کیا تھی؟ کیوں تھی؟ کس کی تھی؟ کس لیے تھی؟ اور وہ خود ہی ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ یہی ہے کہ چند لوگوں نے اپنے ذاتی فائدے کے لیے جمہوری قاعدوں کی خلاف ورزی کی۔

''مختصر یہ کہ لوگ پاکستانیوں سے لڑے نہیں تھے بلکہ لڑائی ان پر کچھ اس طرح سے مسلط کر دی گئی تھی کہ ان کے آگے رونے اور لڑنے کے لیے بھارت سے کمک طلب کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا۔ سوال اپنے وجود کے برقرار رکھنے کا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایسا اچانک ہوا تھا۔ لگتا تھا یہ پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا کہ اقتدار کی منتقلی جمہوری قاعدوں سے ہرگز نہیں کی جائے گی۔ کس لیے کہ اس میں خسارہ چند افراد کا ہوتا تھا۔'' ۹۶

آگے چل کر وہ ایک بار پھر اس صورت حال پر غور کرتے ہیں کہ برصغیر سے باہر دیگر ممالک میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے لوگ باہم امن اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فساد جنم نہیں لیتا مگر اس خطے کے اندر یہ لوگ باہم رہنے پر تیار نہیں۔ غلام محمد اس صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عصبیت کا زہر اس خطے کے لوگوں میں نہیں ہے بلکہ اصل خرابی سیاستدانوں میں ہے جو انھیں بھڑکا کر ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں۔

''جب جب میں مشرقِ وسطیٰ جاتا ہوں جہاں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ بغرضِ ملازمت بڑے امن و چین سے رہتے ہیں۔۔۔ وہاں عصبیتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں مگر وہی لوگ جب اپنے اپنے وطن واپس آتے ہیں تو وہ دوبارہ عصبیتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو کیا اس سے یہ نکتہ برآمد نہیں ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی گڑبڑ سیاسی قیادت کے اندر موجود ہے جو ہنوز فرنگیوں کے رجحانات اپنے اندر رکھتی ہے۔'' ۹۷

سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے لکھی گئی شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس میں بہاریوں کے مسئلے کی طرف اشارہ نہ کیا گیا ہو۔ اس حوالے سے لکھی گئی بیشتر تحریروں میں اس مسئلے کا تذکرہ ملتا ہے۔ غلام محمد اس ناولٹ میں ایک کردار کے ذریعے ان لوگوں کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

''انھوں نے پاکستان سے وفاداری کا کتنا عظیم ثبوت دیا ہے۔ لٹ گئے۔ تباہ و برباد ہو گئے مگر انھوں نے معاملات سے سمجھوتہ نہ کیا۔ وہ بھیک مانگتے کبھی نظر نہ آئے۔ یہ کیسا تضاد ہے۔ پاکستان، جس کے لیے وہ تباہ و برباد ہوئے، انھیں لینے سے انکار کیے جا رہا ہے۔ یہ لوگ بھی

مصر ہیں کہ آدھی روٹی کھائیں گے، پاکستان جائیں گے۔‘‘ ۹۸

ناولٹ میں جہاں سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب وعلل کو جاننے اوراس کے بطن سے جنم لینے والے حادثات کو سمجھنے کے لیے طویل تاریخی پس منظر مدِنظر رکھا گیا ہے وہاں ایک ناولٹ ہونے کے ناطے اس کا تخلیقی مقام بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور آخر پر ناولٹ کے مختلف کرداراور برصغیر کی تقسیم کا عمل ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ایک ساتھ اپنے منطقی انجام سے دوچار ہوتے دکھائی دیے گئے ہیں۔ ناولٹ کا مرکزی کردار ریا کی ٹوٹتی جڑتی محبت کی کڑیوں اور پاکستان کے ٹوٹنے کے عمل کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

> ’’اس نے اپنی کیفیات پر قابو پانے کی غرض سے انہیں رشتوں ناتوں کے ٹوٹنے بکھرنے، پھر تاریخ میں ان کی کڑیوں کے گم ہو جانے سے تعبیر کیا اور یوں اپنے انفرادی المیہ سے گزر کر اس نے بڑے المیوں میں پناہ لینے اور اسے فراموش کر دینے کی کوشش کی جیسے برصغیر کا ٹوٹنا، دوبارہ مکمل ہونا اور پھر نامکمل رہ جانا۔ اس نے سوچا، نامکمل رہ جانے کا احساس کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لگتا ہے لہو قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔‘‘ ۹۹

بنیادی طور پر غلام محمد نے برصغیر کی تقسیم اور پھر پاکستان کے ٹوٹنے کے عمل کو وسیع زمانی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مکاتیب

خط کسی فرد کا نجی عمل ہے چنانچہ اسے باقاعدہ ادبی صنف کا درجہ تو حاصل نہیں تاہم غالب کے خطوط کے بعد اردو ادب میں خطوط ایک باقاعدہ روایت کی صورت اختیار کر کے تاریخی اور ادبی مسلمہ حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کسی فرد کی ذات کو سمجھنے یا کسی دور کا مطالعہ کرنے کے لیے اس زمانے کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ خطوط کی اسی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے سقوطِ ڈھاکہ جیسے ہمہ پہلو سانحے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے لیے خطوط کو بھی شاملِ مطالعہ کیا گیا ہے۔ چونکہ ’’اس عمل میں کسی خدشے، خوف یا خطرے کے بغیر وہ (مکتوب نگار) اپنے جذبات واحساسات اور خیالات وتصورات کو بے محابا آشکارا کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنی کامیابیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو ناکامیوں کے ذکر سے بھی گریز نہیں کرتا اور انداز بھی ایسا اختیار کرتا ہے کہ تحریر سے تصنع، تکلف اور خودنمائی کا زاویہ نمایاں نہ ہو اور حقیقت خود بخود آشکار ہوتی چلی جاتی ہے۔‘‘[۱۰۰] سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر اور پیش منظر سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس پس منظر میں لکھے گئے خطوط کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ اس حوالے سے لکھے گئے خطوط کے بیشتر حصے تو نجی حیثیت کے حامل ہیں تاہم بعض حصے تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہیں۔

اس پس منظر میں لکھے گئے خطوط پر مشتمل مجموعہ ''المیۂ مشرقی پاکستان'' کے نام سے رئیس امروہوی نے مرتب کیا جو ۱۹۷۴ء میں چھپا۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جن میں خطوط کے علاوہ عینی شاہدین کے بیانات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ادیبوں اور شاعروں کے خطوط انفرادی طور پر مختلف رسائل و جرائد میں بھی چھپ چکے ہیں جن میں ''مدیر نقوش'' کے نام لکھے گئے مسعود مفتی کے خطوط خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے اور بعد کے حالات بیان کرتے ہیں۔ معروف افسانہ نگار غلام محمد کے خطوط، جو ان کے افسانوی مجموعے ''لہو قطرہ قطرہ'' میں شامل ہیں، بھی اس سانحے کے کئی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

مسعود مفتی کے خط اس حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے کے حالات، سقوطِ ڈھاکہ کے دوران ہونے والی قتل و غارت اور بعد ازاں کے چند تجربات کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو لکھے گئے ایک خط میں ڈھاکہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''مشرقی پاکستان میں جو بھی جس طرف ہے آج کل شدید کرب میں مبتلا ہے اور نوے فیصد لوگ ایسے ہیں جو ہر چیز سے ناامید ہیں۔۔۔۔۔ یہاں آ کر ان لوگوں کی آنکھوں میں جھانکیے۔ ہیبت، بے یقینی، وہم اور اَن دیکھے بوجھوں سے لبریز فضا کو دیکھیے۔ ریلیف کیمپوں کی سسکتی ہوئی خاموشی کو سنیے۔ ہر طرف منڈلاتی ہوئی موت کے پروں کو دیکھیے۔''۱۰۱

اسی طرح ایک اور خط میں انھوں نے مشرقی پاکستانیوں کے اردو زبان کے ساتھ کیے گئے سلوک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''آپ لوگ وہاں یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں غیر بنگالیوں کو قتل کیا گیا ہے جو یا تو بہار کے تھے یا مغربی پاکستان کے تھے۔ جی نہیں یہ تو تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ مکمل تصویر یہ ہے کہ یہاں اردو اور صرف اردو کو مارا گیا ہے۔ نجیب الطرفین بنگالی جو صدیوں سے یہاں رہتے ہیں صرف اسی وجہ سے قتل کیے گئے ہیں کہ وہ اردو بول سکتے تھے۔''۱۰۲

بنگالیوں کے دلوں میں اردو سے نفرت کا جذبہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کو بھی محض اس جرم میں قتل کر ڈالا کہ وہ اردو بولتے تھے۔ اردو سے نفرت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد وہاں اردو پریس ختم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کنیز بتول کے بقول ''قیامِ بنگلہ دیش کے بعد یہاں رہ جانے والے اردو فن کاروں کے پاس ادبی تخلیق کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نہ اخبار تھا، نہ رسالہ، نہ پریس تھا۔''۱۰۳

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں جس قدر قتل و غارت گری ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مسعود مفتی نے اس بربریت کا مفصل احوال ان خطوط میں پیش کیا ہے جسے پڑھ کر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا کسی انسان سے

اس قدر بربریت کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔۱۹۷۱ء کے زمانے میں مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، ۱۹۴۷ء کے فسادات بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔مشرقی پاکستان میں ۱۹۴۷ء میں نواکھلی کے فسادات، ۱۹۶۹ء میں صدر ایوب خان کے خلاف مہم میں ہونے والی قتل وغارت اور پھر ۱۹۷۱ء میں انسان کا وہ وحشیانہ پن سامنے آیا کہ انسانیت کو شرما کر رکھ دیا۔مسعود مفتی ۱۹۷۱ء کے قتل وغارت کی جڑیں تاریخ میں گزرے ان واقعات میں تلاش کرتے ہوئے بنگالیوں کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔یکم نومبر ۱۹۷۱ء کو لکھے گئے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں۔

''اس اجتماعی طرزِ عمل کی وجہ کیا ہے؟ بہت سوچا مگر آج جواب ملا ہے اور وجہ بھی بڑی معقول ہی ہے کہ ان لوگوں میں Sense of Humour کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہے۔حسِ مزاح نہ ہونے سے یہ لوگ نہ تو اپنے آپ پر ہنس سکتے ہیں اور نہ دوسروں کے ساتھ مل کر۔۔۔ان کو ہنسنا سکھا دیجیے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''[۱۰۴]

ماہ نامہ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل، مسعود مفتی کے اس خط اور اس میں کیے گئے نفسیاتی تجزیے کا جواب بھی ایک خط کی صورت میں دیتے ہیں، جو اسی خط کے ساتھ ہی شائع کیا گیا ہے۔

''آپ کہتے ہیں کہ بنگالیوں میں حسِ مزاح کی کمی ہے۔میں اس بات کو نہیں مانتا۔جو خطہ قدرتی حسن کے علاوہ رقص اور موسیقی ایسی لطافتوں سے مالا مال ہو۔وہ حسِ مزاح سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہوسکتا۔یہ سارا کھیل سیاست کا ہے۔کرسیوں کا ہے۔محرومیوں کا ہے۔زیادتیوں کا ہے۔ورنہ بنگالی ہم سے زیادہ مسلمان ہیں۔''[۱۰۵]

اردو کے معروف ادیب اور افسانہ نگار غلام محمد نے بھی مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے پس منظر میں کئی سوالات اٹھائے اور دیگر ادیبوں سے بذریعہ خط بحث کی۔ان کی وفات کے بعد، ان کے یہ خطوط احمد زین الدین نے ان کے افسانوی مجموعے ''لہو قطرہ قطرہ'' میں شائع کر دیے ہیں۔ان خطوط کا مرکزی نکتہ بھی مشرقی پاکستان کی علاحدگی اور اس علاحدگی کے بطن سے جنم لینے والے کئی سوالات ہیں۔انھیں اس بات کا شکوہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے پس منظر میں لکھی گئی اکثر تحریریں واقعے کا صرف ایک رخ پیش کرتی ہیں اور اردو زبان میں لکھی گئی یہ تحریریں علاقائی تعصب سے بالاتر ہو کر اسے بطور انسانی المیہ پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔

''قصہ یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء کے واقعے کے دو پہلو تھے۔شکست پاکستانیوں نے اٹھائی جن کی سرکاری یا مادری زبان اردو تھی چنانچہ شکست کی داستانیں مع دیگر تفصیلات، اردو زبان میں یوں رقم کی گئیں کہ واقعے کے دوسرے پہلو کے لیے اردو ادب میں گنجائش نکلتی نظر نہیں آتی ہے۔یوں دیکھا جائے تو (اردو یعنی) زبان سے جو عصبیت برآمد ہوئی تھی، ہمارا ادب اس کی

لپیٹ میں آ گیا اور آلودہ ہوا۔''۱۰۶؎

۷ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ڈھاکہ سے لکھے گئے ایک خط میں وہ مذکورہ موضوع پر لکھے گئے افسانوی ادب سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے اور اسے بھی صرف ایک پہلو کا عکاس قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سن ۱۹۷۱ء کے بعد اس واقعہ پر جو افسانے لکھے گئے ہیں ان سے ایک قوم کی تضحیک ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنگالی قوم بڑی سنگدل واقع ہوئی ہے اور بربریت میں وہ اپنی مثال نہیں رکھتی۔تخلیقی ادب کے معاملے میں دیگر مذہب یا قوم پر تبصرہ کرنے سے قبل جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ادیبوں پر لازم آتا ہے کہ وہ پہلے اپنی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔پھر اپنی زبان کھولیں۔انسانی المیہ کا عنصر ان افسانوں میں سرے سے لاپتہ ہے۔''۱۰۷؎

غلام محمد یکم مئی ۱۹۸۶ء کو طاہر مسعود کے نام لکھے گئے ایک خط میں اس بنگالی مؤقف کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے مرکزی حکومت نے اہل بنگال کے جذبات واحساسات کا خیال نہ کیا اور ان پر اردو زبان زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی جو ایک غیر جمہوری رویہ تھا۔اسی طرح بنگال کے اندر اردو بولنے والوں کی حکومت کی طرف سے کی جانے والی حمایت نے بھی بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے۔وہ لکھتے ہیں۔

''پاکستان کی واحد سرکاری زبان کے اعلان سے بنگالی مسلمانوں کے ماضی قریب کی تاریخ کا تلخ ترین تجربہ ان کے آگے دوبارہ پیش کیا۔اس کے خلاف احتجاج منطقی طور پر ہوا۔۔۔ سابقہ مشرقی پاکستان کے حکمران جن کی پوسٹنگ یہاں ہوئی تھی وہ اردو بولتے تھے۔اردو کے حوالے سے انھیں بہاریوں کا طبقہ قابل اعتماد نظر آیا۔انھوں نے اس طبقے پر تکیہ کیا۔ان کے لیے خاص طور پر کالونیاں بنائی گئیں۔''۱۰۸؎

مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر میں رئیس امروہوی کے مرتب کردہ خطوط بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے یہ خطوط ۱۹۷۴ء میں دو جلدوں میں شائع کیے۔ان خطوط میں سے بیشتر بنگلہ دیش کے مہاجر کیمپوں میں رہنے والے بہاریوں کے تحریر کردہ ہیں۔اس کے علاوہ ہندوستان میں قید جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، جنرل راؤ فرمان علی خان، جنرل محمد حسین انصاری کے خطوط بھی شامل ہیں۔ان حضرات کے خطوط میں مشرقی پاکستان یا کیمپ کی صورتحال کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ یہ خط مذہبی احساس کے حامل ہیں۔ایک خط میں جنرل نیازی تحریر کرتے ہیں۔

''باقی صدیقی صاحب سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔اس کے کاموں میں کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے اور ان میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ کی رضا پر راضی رہے۔اسی پر بھروسہ رکھے۔اللہ کے یہاں ہر بات کے لیے ایک حساب ہے اور ہر معاملے

کے لیے ایک مقررہ معیاد۔ جب تک وہ وقت نہ آجائے اس بات کا ظہور نہیں ہوسکتا۔''[۱۰۹]

خطوط کے اس مجموعے میں زیادہ تعداد ان بہاریوں کے خطوط کی ہے جو قیامِ بنگلہ دیش کے بعد کیمپوں میں محصور ہو گئے۔ انھوں نے ان خطوط میں اپنی حالتِ زار بیان کی ہے۔ یہ لوگ جو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو گئے، ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر دربدر ہو کر رہ گئے اور ان کے گھر بار چھین لیے گئے۔ اس تلخ تجربے کے بعد یہ لوگ مایوسیوں میں گھر گئے۔ کیمپوں میں نہ ان کی عزت محفوظ تھی نہ رہنے کے لیے مناسب جگہ اور نہ کھانے پینے کے لیے خوراک کا بندوبست تھا۔ یہ خطوط ان حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک خط میں مشرقی پاکستان کے ایک جریدے ''شاہکار'' کے مدیران حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''برادرم بیس اکیس ماہ کی غیر یقینی صورتحال اور کسمپرسی کی زندگی گزارتے گزارتے اب اکتا گیا ہوں۔ ہم لوگوں کا طبقہ ایک ایسا طبقہ ہے جس پر شاید قدرت کو بھی رحم نہیں آتا۔ ہم کہیں بھی اطمینان وسکون کا سانس نہیں لے سکتے۔ خدا رحم کرے۔''[۱۱۰]

شمالی بنگال کے معروف شاعر شمیم کاشفی ایک خط میں اپنے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''میں سید پور میں بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مسئلوں میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اگر یہی عالم رہا تو آنے والا وقت ہوسکتا ہے اور بھی بھیانک ثابت ہو۔ اپنا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ہے۔ جو بھی لوگ ہیں وہ خود بھی پریشان ہیں۔ ایسے عالم میں دل ودماغ پر کیا گزرتی ہوگی آپ لوگ خود اندازہ لگا کر دیکھیں۔''[۱۱۱]

ایسے صدمات کو برداشت کرتے کرتے انسان تنگ آجاتا ہے اور مایوسی کے چنگل میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کی حکومت نے ان لوگوں کو بے دخل کر دیا اور پاکستان نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسے حالات میں حساس لوگوں کے ذہنوں میں اس سوال نے فطری طور پر جنم لیا کہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے آباؤ اجداد پاکستان آئے ہی کیوں تھے؟

> ''نہ جانے ہمارے والدِ محترم کیوں پاکستان آئے تھے، اپنی جائداد ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ ''ہند'' میں یہ نعرہ بلند ہوتا تھا ''ماریں گے، مر جائیں گے، لے کے رہیں گے پاکستان'' اب یہ نعرہ، ہم لوگوں پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔''[۱۱۲]

ایک اور خط میں اپنی تباہ حالی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ''بند دروازے ہیں، تاریکیاں ہیں اور ہم ہیں۔ مستقبل بھیانک ہے۔ یہاں کیسے رہا جاسکتا ہے۔ نوکری چاکری، تجارت سب ختم، گھروں پر قبضہ جما لیا گیا۔''[۱۱۳]

فیاض احمد نے ایشرڈی بنگلہ دیش کے ایک کیمپ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''معاشی بدحالی ایسی ہے کہ میں لکھ نہیں سکتا۔ جیسے امراء، فقراء میں تبدیل کردیے جائیں۔ جیسے حاکم، محکوم بنا ڈالے جائیں۔ فاقہ کشی، معمول بن گئی ہے۔ مال اسباب لٹ چکا۔۔۔ ہم میں ہمارا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ ذلت ہے، رسوائی ہے، خامشی ہے، فریاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جسم و جاں کا رشتہ برقرار ہے کہ نظامِ تنفس پر کنٹرول نہیں ورنہ کب کے ہم لوگ ہوا ہو گئے ہوتے۔''[۱۱۴]

مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر میں لکھے گئے یہ خطوط تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط میں جہاں سقوطِ مشرقی پاکستان کے نتیجے میں افراد کی نجی زندگیوں پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے وہاں ان خطوط میں فکری حوالے سے بھی کئی سوالات سامنے آتے ہیں۔

ڈراما

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پسِ منظر میں ڈراموں کی تعداد کچھ خاص نہیں۔ ایک ڈرامہ مسعود مفتی نے لکھا جو ان کے افسانوی مجموعے ''ریزے'' میں شامل ہوا۔ مسعود مفتی کے بقول انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے کہنے پر ڈرامہ لکھا تھا اور مزید ڈرامے بھی لکھنا چاہتے تھے مگر بعض اختلافات کے باعث یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔[۱۱۵] مسعود مفتی کے اس ڈرامے کا عنوان ''دسمبر ۱۹۷۱ء'' ہے۔ جس میں ڈھاکہ کے ۱۶، ۱۷، ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کے تین دنوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ ڈرامہ اس مرکزی نقطے کے گرد گھومتا ہے کہ اس زمانے میں انسانی رشتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا اور انسان محض بنگالی اور غیر بنگالی کے ناموں میں منقسم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ دوست جو بچپن میں ایک ساتھ کھیلے، پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی، علاقائی تعصب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے اور پڑوسی جو زندگی کے تمام معاملات میں ایک دوسرے کے شریک تھے، ایک دوسرے کو مارنے پر تیار ہو گئے۔ یہ دو گھرانوں کی کہانی ہے جن میں سے ایک بنگالی ہے اور دوسرا غیر بنگالی۔ ایک موقع پر بنگالی کو شک پڑ جاتا ہے کہ غیر بنگالی نے اپنے گھر میں کسی کو پناہ دے رکھی ہے۔ وہ اسی ٹوہ میں لگا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے گھر سے دو مغربی پاکستانی سپاہی پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور انھیں اور پڑوسی کو انھیں پناہ دینے کے جرم میں مکتی باہنی کے حوالے کرنا چاہتا ہے کہ عین وقت پر اس کا بیٹا آڑے آ جاتا ہے جو خود بھی ہر مغربی پاکستانی کو مٹانے کے درپے تھا مگر قتل و غارت کے مناظر دیکھ کر اس کام سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ غیر بنگالی، بنگالی کے اس بیٹے کو بھی اپنے اس جرم میں شریک کر کے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔

''سلام: ''توفیق بابو یہ نہ سمجھ میں تمھیں معاف کر دوں گا۔ میں آج ہی رپورٹ کروں گا۔''

توفیق: ''سلام بھائی آپ رپورٹ نہیں کریں گے کیونکہ اب میرے جرم میں آپ کا بیٹا بھی

شریک ہے۔ جو میرا حشر ہوگا وہی آپ کے بیٹے کا ہوگا۔اس لئے آپ رپورٹ نہیں کریں گے۔''

سلام:''تم پھر چالاکی کر گئے میرے ساتھ۔ میں ابھی جا کر اسے روکتا ہوں۔''

توفیق:(راستہ روک کر پستول تان لیتا ہے)''آپ نہیں جاسکتے یہاں سے جب تک عطا ان کو چھوڑ کر واپس نہیں آجاتا۔''

(سلام اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)'' ۱۱؎

ایک طرف سلام کا بیٹا اپنے بچپن کے دوست کو قتل کرنے کا خواہشمند ہے جب کہ دوسری طرف پڑوسی سلام، اپنے پڑوسی توفیق کا دشمن بن بیٹھا ہے۔ یہ دونوں کردار اس دور میں مٹ جانے والی انسانی ہمدردی کی عکاسی کرتے ہیں جب ایک عرصے تک اکٹھی زندگی گزارنے والے لوگ اور بچپن میں ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہونے والے دوست ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے مگر مسعود مفتی ڈرامے کے آخری حصے میں سلام کے بیٹے کے ذریعے یہ بھی دکھاتے ہیں کی آخری فتح انسانیت کی ہوتی ہے اور انسان وحشیانہ پن سے اُکتا کر عظیم انسانی رشتوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

حوالہ جات

۰۱۔ مسعود مفتی، پیش لفظ: یادوں کے جھروکے، اسلام آباد، پکٹوریل پرنٹرز، ۱۹۷۶ء، ص ۴

۰۲۔ مسعود مفتی، چہرے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص ۷

۰۳۔ مسعود مفتی، انٹرویو: خالد ہمایوں، لاہور، ماہ نامہ ''قومی ڈائجسٹ''، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۴۳

۰۴۔ مسعود مفتی، چہرے، محولہ بالا۲، ص ۱۲

۰۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۰۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۰۷۔ ایضاً، ص ۱۳، ۳۰

۰۸۔ ایضاً، ص ۳۵

۰۹۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۰۔ خاطر غزنوی، ''اردو میں رپورتاژ''، پشاور، مجلّہ ''خیابان''، شعبۂ اردو، جامعہ پشاور، ۱۹۹۵، ص ۲۹۳

۱۱۔ مسعود مفتی، چہرے، محولہ بالا۲، ص ۷۰، ۶۹

۱۲۔ مسعود مفتی، چہرے، محولہ بالا۲، ص ۸۵

۱۳۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، رپورتاژ نگاری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۷

۱۴۔ مسعود مفتی، ہم نفس، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۲۵

۱۵۔ مسعود مفتی، ماہ نامہ قومی ڈائجسٹ، محولہ بالا۳، ص ۴۳

۱۶۔ مسعود مفتی، ہم نفس، محولہ بالا۱۴، ص ۵۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۲۶۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، رپورتاژ نگاری، محولہ بالا۱۳، ص ۲۱۷

۲۷۔ مظفر علی سید، دیباچہ: زندہ بہار، لاہور، دستاویز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰،۹

۲۸۔ فہمیدہ ریاض، زندہ بہار، محولہ بالا۲۷، ص ۵۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۸

۳۱۔ راقم کی انور رضا سے ایک ملاقات، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۱۳ فروری ۲۰۰۷ء

۳۲۔ مسعود مفتی، لمحے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۶۔ احمد رضا قصوری، اِدھر ہم، اُدھر تم، لاہور، برٹینیکا پبلشرز، س۔ن، ص ۲۳۱

۳۷۔ مسعود مفتی، لمحے، محولہ بالا ۳۲، ص ۲۵

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۶۳

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۴، ۲۳

۴۲۔ راقم کی مسعود مفتی کے ساتھ ایک گفتگو، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۰۶ء

۴۳۔ مسعود مفتی، لمحے، محولہ بالا ۳۲، ص ۳۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۶۔ ڈاکٹر مقصودہ حسین، مسعود مفتی۔ شخصیت و فن، راول پنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۸، ۱۲۷

۴۷۔ مسعود مفتی، پیش لفظ: یادوں کے جھروکے، محولہ بالا ۱، ص ۵

۴۸۔ انور رضا، یادوں کے جھروکے، محولہ بالا ۱، ص ۸

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۵۰۔ ایضاً، ص ۶۶

۵۱۔ ایضاً، ص ۶۸

۵۲۔ ایضاً، ۳۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۵۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۵۸۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۶۰۔ سید ضمیر جعفری، جدائی کا موسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۷، ۳۶

۶۲۔ سید ضمیر جعفری، جدائی کا موسم، محولہ بالا ۶۰، ص ۴۰

۶۳۔ ایضاً، ص ۶۴

۶۴۔ ایضاً، ص ۷۳

۶۵۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۶۸۔ مسعود مفتی، پیش لفظ: یادوں کے جھروکے، محولہ بالا ۱۱، ص ۵

۶۹۔ پروفیسر فروغ احمد، اسلامی ادب، تخلیقی ادب ۲، کراچی، عصری مطبوعات، ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۷

۷۰۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، راول پنڈی، مکتبہ سرمد، بارنہم، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۹

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۹

۷۳۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور، الفیصل پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص ۹

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۵۔ ایضاً، ص ۳۱

۷۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۷۷۔ ایضاً، ص ۲۲۳، ۲۲۲

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۲۹

۷۹۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۸۰۔ کرنل سید مقبول حسین، کیمپ ۴۵، راول پنڈی، حرف اکادمی، ۲۰۰۵ء، ص ۶

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۸۳۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۸۴۔ فتح محمد ملک، دیباچہ: کیمپ ۴۵، محولہ بالا ۸۰، ص ۱۴

۸۵۔ کیپٹن نور احمد قائم خانی، فتح گڑھ سے فرار، لاہور، مکتبہ داستان، بارششم، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۷

۸۷۔ کیپٹن نور احمد قائم خانی، فتح گڑھ سے فرار، محولہ بالا ۸۵، ص ۵۶،۵۵

۸۸۔ ایضاً، ص ۵۸،۵۷

۸۹۔ ام عمارہ، ''کروٹ''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، جولائی اگست ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۰

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۹۴۔ غلام محمد، لہو قطرہ قطرہ، کراچی، نشری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۵

۹۵۔ راقم کی مسعود مفتی کے ساتھ ایک گفتگو، محولہ بالا ۴۲

۹۶۔ غلام محمد، لہو قطرہ قطرہ، محولہ بالا ۹۴، ص ۱۷۹

۹۷۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۹۸۔ غلام محمد، لہو قطرہ قطرہ، محولہ بالا ۹۴، ص ۱۹۳

۹۹۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۱۰۰۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اردو میں خطوط نگاری''، مجلّہ ''خیابان''، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۶۳

۱۰۱۔ مسعود مفتی، مکتوب بنام محمد طفیل، لاہور، ماہ نامہ ''نقوش''، نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۵

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۱۰۳۔ ڈاکٹر کنیز بتول، بنگلہ دیش میں اردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۰

۱۰۴۔ مسعود مفتی، مکتوب بنام محمد طفیل، محولہ بالا ۱۰۱، ص ۱۷۱

۱۰۵۔ محمد طفیل، مکتوب بنام مسعود مفتی، محولہ بالا ۱۰۱، ص ۱۷۲

۱۰۶۔ غلام محمد، مکتوب بنام طاہر مسعود، لہو قطرہ قطرہ، محولہ بالا ۹۴، ص ۲۶۳

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۱۰۸۔ غلام محمد، مکتوب بنام طاہر مسعود، لہو قطرہ قطرہ، محولہ بالا ۹۴، ۲۶۹

۱۰۹۔ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، مکتوب بنام محمد حسن امام صدیقی، المیہ مشرقی پاکستان، مرتبہ: رئیس امروہوی، کراچی، رئیس اکیڈمی، ۱۹۷۴ء، ص ۹

۱۱۰۔ شیخ بدرالدین احمد، مکتوب بنام محمد حسان امام صدیقی، المیہ مشرقی پاکستان، محولہ بالا ۱۰۹، ص ۲۴

۱۱۱۔ شمیم کاشفی، ایضاً، ص ۳۳، ۳۲

۱۱۲۔ مصطفیٰ پرویز، ایضاً، ص ۳۶

۱۱۳۔ ایس۔ ایم۔ شریف خان، ایضاً، ص ۳۶

۱۱۴۔ فیاض احمد، ایضاً، ص ۴۹

۱۱۵۔ راقم کی مسعود مفتی کے ساتھ ایک ملاقات، محولہ بالا ۴۲

۱۱۶۔ مسعود مفتی، ریزے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۹

باب پنجم

ماحصل

برعظیم کے مسلمانوں نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر، ہزاروں قربانیاں دے کر جو وطن حاصل کیا، محض چوبیس سال کے عرصے میں اس کا ٹوٹ جانا، ایک ایسا المناک سانحہ ہے، جس نے ہر محبِ وطن پاکستانی کا سر ندامت سے جھکا دیا۔ ۱۹۴۷ء میں شاعروں اور ادیبوں نے لوگوں کو آزادی کے خواب دکھائے، ان کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کیا جس سے پوری قوم کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وطن سے محبت کے اس جذبے کو برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے کی ضرورت تھی مگر اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی چنانچہ وطن اور قوم کی محبت کے جذبے پر مادیت پرستی کا رجحان غالب آنے لگا اور پاکستانی معاشرہ طبقاتی تقسیم میں بٹ کے رہ گیا۔

> ''ہمارے یہاں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی قومیت کے شعور میں جو تزلزل پیدا ہوا اس کی بنیادی وجہ بھی یہ طبقاتی تفریق تھی اور اسی وجہ سے پاکستان کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے...... اس صورتحال کے نتیجے میں ہمارا وجود تک خطرے میں پڑ گیا۔ ہم خود اپنے اعمال سے اپنے وجود کی نفی کرنے پر تلے رہے اور بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہ ہوا۔'' [۱]

ایسے حالات میں ادیبوں کا یہ فرض تھا کہ وہ قوم کی راہنمائی کرتے، لوگوں کے اندر پاکستانی قومیت کا شعور اجاگر کرتے ہوئے ان کے گرد و پیش منڈلاتے خطرات سے انھیں آگاہ کرتے اور ان کے اندر وہ قومی وقار پیدا کرتے جو انھیں مادی قدروں سے بلندتر اعلیٰ و ارفع مقام پر لے جاتا مگر افسوس اس میدان میں بھی حوصلہ افزا صورتِ حال دکھائی نہیں دیتی۔ ایک نئی قوم کے افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی بجائے روایتی، گروہی یا ایسا علامتی ادب تخلیق کرنے پر زور رہا جسے لوگوں کی اکثریت سمجھنے سے قاصر تھی۔ وطن سے محبت کا جذبہ اجاگر کرنے کے حوالے سے روا رکھی جانے والی عدم توجہی کا نتیجہ کس قدر دوررس اور نقصان دہ ہو سکتا ہے، اس بارے میں کسی نے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس سے ہماری جڑیں کمزور ہونا شروع ہو گئیں۔

> ''...... نتیجہ یہ کہ پاکستان کی فکری اساس کے مخالف دانشوروں کا آفاقیت کا وہ تصور خوب پھلا پھولا جو ہمارے قومی وجود کی نفی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تصور اقبال کے تصورِ آفاقیت اور پاکستان کی بقا سے جنگ آزما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آقا و غلام اور رنگ و نسل کے امتیازات سے ماورا وہ جہانِ نو پیدا نہ ہو سکا جس کی فکری اساس تو جُوں کی تُوں رہے مگر جس کی زندگی ہر

لحظہ ایک نئے انقلاب کی طلب گار ہو۔''۲؎

انھیں حالات میں ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ گئی۔اس جنگ نے پوری قوم کو ایک بار پھر سوچنے پر مجبور کر دیا۔محبِ وطن پاکستانیوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان کا کوئی دشمن بھی ہے جو ہر وقت ان کی تاک میں ہے۔ اس سوچ نے انھیں اکٹھا ہونے پر مجبور کر دیا۔شاعروں اور ادیبوں کو ایک بار پھر احساس ہوا کہ جو دھرتی ان کی شناخت کا سبب ہے، اگر وہی دشمن کے ناپاک ارادوں کا شکار بن گئی تو ان کی پہچان ہی مٹ کر رہ جائے گی۔اس احساس کی بدولت ۶۵ء کی جنگ کے دوران ادب کی ہر صنف کے ذریعے وطن سے محبت کا جذبہ ابھارا گیا مگر جنگ کے خاتمے پر مشرقی پاکستان کے حوالے سے ایک نئی صورتِ حال ابھر کر سامنے آئی۔اس جنگ کے دوران اس حصے کے لوگوں کو شدید عدم تحفظ کا احساس ہوا مگر جنگ کے بعد ان کے احساس کو مٹانے کے لیے کوئی بھی عملی کوشش سامنے نہ آئی اور نہ ہی ان کی دیگر محرومیوں کی طرف توجہ دی گئی۔واضح نظر آرہا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ہر حوالے سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔نتیجتہً دونوں حصوں کے لوگ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والی دوری بڑھتی گئی اور آہستہ آہستہ اس نے ایک ایسی نفرت کا روپ دھار لیا جس کا منطقی نتیجہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے سانحے کی صورت میں سامنے آیا۔اس دور تک لکھے گئے اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے ادیبوں نے دونوں حصوں کے درمیان اس بڑھتی خلیج کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ایسی صورتحال میں ہمارے ادیبوں کا یہ فرض تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں بسنے والے عام پاکستانیوں کو حالات سے آگاہ کرتے اور حتی الامکان اپنی تخلیقات کے ذریعے اس کے تدارک کے لیے بھی کوشاں رہتے مگر ہمیں اس دور تک لکھے گئے ادب، خصوصاً نثری ادب میں چند افسانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ادیب جو معاشرے کی آنکھ کا کردار ادا کرتے ہیں، ان کا یہ فرض تھا کہ وہ نہ صرف دونوں حصوں کے درمیان بڑھتے مسائل کی طرف لوگوں اور حکمرانوں کی توجہ دلاتے بلکہ اس کے نتائج سے بھی آگاہ کرتے۔

> ''ادیب معاشرے کا سب سے ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔کوئی محسوس کرے یا نہ کرے لیکن ادیب ہر لمحہ کو، ہر واقعہ کو، صحیح پس منظر میں سب سے پہلے سمجھ لینے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچانا اور روشنی دکھانا اس کا فرض ہو جاتا ہے...... ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات، سیاسی وسماجی رجحانات، قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنے طریقہ پر سلجھانا بھی تو ہمارا ہی کام ہے۔آخر صرف اخبار نویس تو اس بات کو حسنِ خوبی سے انجام نہیں دے سکتے۔ ہمارے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ہیرو اور کردار یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔''۳؎

مگر ہمارے ادیبوں نے مشرقی پاکستان کے بگڑتے حالات سے مکمل پہلو تہی اختیار کیے رکھی حتیٰ کہ ملک دولخت ہوگیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان میں اقتدار کا جو کھیل شروع ہوا، جس طرح زندگی کے ہر میدان میں ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی جانے لگی اور مارشل لاء، جاگیرداری اور افسر شاہی نے عوامی خواہشات کو پسِ پشت ڈالنا شروع کیا۔ ادیبوں کا فرض تھا کہ وہ قوم کو اپنی تحریروں کے ذریعے اس صورتِ حال سے آگاہ کرتے اور اس کے خلاف قلمی جہاد کرتے مگر ہمارے اکثر ادیب اس سے لاتعلق رہے اور ملک کی جڑیں کمزور ہوتی چلی گئیں۔ ''وطن کا قرض'' کے مرتبین ملکی صورتِ حال اور ادیبوں کے رویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ کو انتشارِ فکر و نظر کا دور کہا جا سکتا ہے۔ سازشوں کے جال بچھائے جا رہے تھے۔ کوتاہ قد اور کوتاہ فکر قائد قوم کے سروں پر مسلط کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیاں نعروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ مشرق میں مغرب کو لوٹ مار کا ذمہ دار اور مغرب میں مشرق کو اقتصادی بدحالی کا سبب قرار دیا جا رہا تھا۔ مارشل لاء، جبر، جائز محرومیاں اور ان کی ناجائز تشہیر، افواہوں کے بالمقابل صحیح حقائق عام کرنے میں بیوروکریسی کی ناکامی، ابلاغِ عامہ اور تعلیم کے شعبوں میں سوچی سمجھی ناقص پالیسیاں۔ بے شمار عوامل تھے جو منفی سوچ اور علاحدگی کا رجحان پیدا کر رہے تھے، لیکن بہت سے ادیبوں نے نہ ان عوامل پر غور کیا اور نہ مثبت فکر کے چراغ جلانے کی کوشش کی۔''[۴]

ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو ادب میں ''حُبِ وطن کے اجتماعی اور قومی تصورات'' کی عدم موجودگی کے اسباب کا سراغ لگانے کے لیے اس کے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''شاہیت اور شخصی حکومت نے صدیوں سے اس طرح سوچنے اور غور کرنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب میں اجتماعی شعور، ایک زمانے تک، نام کو بھی پیدا نہیں ہوا اور اسی کا یہ اثر ہے کہ عرصے تک اس میں حُبِ وطن کے اجتماعی اور قومی تصورات کی روایت قائم نہ ہو سکی۔''[۵]

اسی غفلت کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔ اتنا بڑا حادثہ ایک دن میں جنم نہیں لیتا۔ فصل بوئی گئی، اس کی آبیاری کی گئی، پکنے میں وقت لگا اور پھر اس کے کاٹنے کا مرحلہ آیا مگر ہمارے ادیب اس سارے عمل سے لاعلم نہیں تو لاتعلق ضرور رہے حتیٰ کہ ۱۶ دسمبر کا دن آن پہنچا۔ احمد ہمیش کے بقول ''غور کیا جائے تو یہ دوسری جنگِ عظیم سے زیادہ المناک واقعہ تھا۔''[۶] جب قوم کے سَر احساسِ ندامت سے جُھک گئے تو ہمارے کچھ ادیبوں کو خیال آیا کہ یہ موضوع بھی ہماری توجہ کا طالب تھا۔ چند ادیبوں کو احساس ہوا کہ ان کا منصب کیا تھا اور اس منصب کے تقاضے کیا

تھے تو ان کے ہاں ملی اور وطنی شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اشفاق بخاری کے بقول:

''۱۹۷۱ء سے پیشتر عموماً ملی شعور محض بیانات، توضیحات اور تشریحات تک محدود ملتا ہے لیکن سقوطِ ڈھاکہ نے ادیب کو سیاسی اور جذباتی بحران سے دوچار کیا ہے۔ اسے اب اپنی بددیانتی کا احساس سا ہوا ہے کہ جس نے اس کے تن پر پوشاک اور جینے کے لوازمات مہیا کیے ہیں وہ اسے ہمیشہ پائمال، پیش پا افتادہ اور غیر معیاری نظر آئے اور اب وہی اس سے اپنا حساب مانگ رہے ہیں کہ تم ہی کہو فن کار؟ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ تمھیں الہام ہوتا ہے، حقیقتیں تمھیں آ آ کر گلے ملتی ہیں، یہ سب کیا ہوا؟ کون ذمہ دار ہے؟ ہم تو وسائل کی پیداوار میں ہی گم رہے، تم ہمیں کیوں بروقت مطلع نہ کر سکے۔'' [۷]

اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے والے ادیبوں میں بڑی تعداد ان ادیبوں کی ہے جو براہِ راست اس سانحے سے متاثر ہوئے۔ مغربی پاکستان کے اکثر ادیب چونکہ اس حادثے کے اثرات سے محفوظ رہے۔ لہٰذا یہ قومی المیہ ان کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی اکثر تحریریں ان ادیبوں کی ملتی ہیں جنھوں نے خود اس حادثے کو دیکھا اور کسی نہ کسی طرح ذاتی طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ ان ادیبوں نے ناول، افسانے، رپورتاژ، ڈائری، روداد اور ناولٹ کے ذریعے حادثے کے مختلف پہلوؤں سے قاری کو روشناس کرا کے فرض کفایہ ادا کیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ ایک ہمہ پہلو سانحہ تھا۔ قومی حوالے سے ہمیں ایک ایسی شکست کا سامنا کرنا پڑا جس نے محب وطن پاکستانیوں کو ایسے کرب میں مبتلا کر دیا جس کا مداوا ممکن نہ تھا۔ ہمارے ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے شکست کے اسباب وعلل کا طویل پس منظر میں جائزہ لیا۔ ہمیں ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ دکھایا، دشمن کی سازشوں سے پردہ اٹھایا اور ہمارے اندر نیا ولولہ اور جوش پیدا کر کے ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد کا درس دیا۔

سقوطِ ڈھاکہ کا دوسرا بڑا پہلو انسانی حوالے سے سامنے آیا۔ اس دور میں انسان کے جس قدر روپ دیکھنے کو ملے وہ عام حالات میں ممکن نہیں ہوتے۔ وحشت کے اس دور میں تہذیب وتمدن کے وہ سارے نقاب اس کے چہرے سے ہٹ گئے جن کے نیچے وہ عام حالات میں اپنے چہرے کو چھپائے پھرتا ہے۔ ہمارے ادیبوں نے آشوب کے ان دنوں میں انسانوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے اپنی تخلیقات میں سمویا۔ ہمارے مؤرخین نے اس المیے کو اپنی نظر سے دیکھا اور بیان کیا مگر ہمارے ادیبوں نے نہ صرف سیاسی وسماجی پہلو سے اس حادثے کا جائزہ لیا بلکہ فرد کے باطن میں اتر کر ایسے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا جو مؤرخ کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھنے والے بعض ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں اس سانحے کو طویل

تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے قاری کے سامنے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے حالات وواقعات اس طرح پیش کیے ہیں کہ قاری کو ۱۶دسمبر کا سانحہ واقعات کے تسلسل کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔طویل تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی تحریروں میں ناول خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔فنی اعتبار سے ناول ہی ایک ایسی صنف ہوسکتی تھی جس میں ادیب اس قدر طویل تاریخی پس منظر سمیت تمام پہلوؤں کا مکمل احاطہ کرسکیں۔رضیہ فصیح احمد ''صدیوں کی زنجیر''، سلمٰی اعوان ''تنہا''، الطاف فاطمہ ''چلتا مسافر'' اور انتظار حسین ''بستی'' میں طویل زمانی کینوس پر پھیلے حالات وواقعات کو ناول کی صورت میں اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔رضیہ فصیح احمد صدیوں سے زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے افراد کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات اور ان تنازعات کے نتیجے میں ٹوٹتے بکھرتے انسانوں کا احوال بیان کرتی ہیں۔سلمٰی اعوان قیامِ پاکستان کے وقت بنگالیوں کی جدوجہد اور ان کی توقعات کی عکاسی کرتی ہیں اور پھر مختلف حادثات وواقعات کے باعث دونوں حصوں کے درمیان آہستہ آہستہ پھیلتی نفرت اور اس نفرت کے نتیجے میں رونما ہونے والی علاحدگی کا ذکر اس انداز میں کرتی ہیں کہ قاری قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ مشرقی پاکستان تک کے حالات وواقعات کو پوری طرح سمجھ لیتا ہے۔الطاف فاطمہ کے ناول کا مرکزی کردار بھی وہ مسلسل چلتا ہوا مسافر ہے جو ۱۹۴۷ء سے عازمِ سفر ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد آج تک سفر میں ہے۔اس نے جس مقام کو اپنی منزل جان کر اس کی سرزمین میں اپنی جڑیں پیوست کرنے کی کوشش کی، وہ سرزمین بھی اس کے لیے مقتل ثابت ہوئی اور ۱۹۴۷ء کی طرح ۱۹۷۱ء میں اسے اپنا سب کچھ لٹا کر ایک بار پھر عازمِ سفر ہونا پڑا۔انتظار حسین ''بستی''، میں بھی اپنی زمین سے جدا ہونے والے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو تمام عمر اپنی زمین سے بچھڑنے کے دکھ میں مبتلا رہے۔

چند افسانہ نگاروں نے بھی تمام تر اختصار کے باوجود، بعض افسانوں میں، طویل زمانی کینوس استعمال کرتے ہوئے، ۴۷ء سے ۷۱ء تک کے حالات کو چند صفحات میں بیان کردیا ہے۔اس ضمن میں لکھے گئے افسانوں میں شہزاد منظر کا افسانہ ''یوٹوپیا'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار قیامِ پاکستان کے کچھ عرصے بعد مشرقی پاکستان کا رخ کرتا ہے مگر اس عرصے میں وہاں کے حالات بدل چکے ہوتے ہیں چنانچہ مشرقی پاکستان میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ مراجعت اختیار کرلیتا ہے۔مشرقی پاکستان سے واپس جاتے ہوئے اس کی ملاقات ایک ایسے قافلے سے ہوتی ہے جو امن وسکون کی تلاش میں مشرقی پاکستان جارہا ہوتا ہے۔اختر جمال کا افسانہ ''دوسری ہجرت'' بھی ۴۷ء اور ۷۱ء کی ہجرت کے ذریعے چوبیس سالوں کی داستان بیان کرتا نظر آتا ہے۔اس افسانے میں قیامِ پاکستان سے قیامِ بنگلہ دیش تک کے مختلف حالات وواقعات کو ارتقائی صورت طے کرتے پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح اختر جمال کے ایک اور افسانے ''پسِ دیوارِ زنداں'' میں بھی طویل زمانی پس منظر کے ذریعے ۴۷ء سے ۷۱ء تک کا ذکر جامع انداز

میں ملتا ہے۔

ہمارے ادیبوں نے سانحۂ مشرقی پاکستان کا باعث بننے والے عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے زبان کے مسئلے کو اس سانحے کا بنیادی نکتہ قرار دیا ہے۔ معروف افسانہ نگار غلام محمد ایک خط میں اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دیے جانے کے اعلان کو ''بنگالی مسلمانوں کے ماضی قریب کا تلخ ترین تجربہ''[۸] قرار دیتے ہیں۔ زبان کا معاملہ افہام وتفہیم سے حل کرنا چاہیے تھا اور اس حوالے سے بنگالیوں کے جذبات و احساسات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ انھیں اپنی زبان سے شدید محبت تھی، وہ اسے اپنی تہذیب وتمدن کا آئینہ دار خیال کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ہم تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ضرور ہیں پر ہماری زبان وسیع علمی اثاثہ کی مالک ہے۔ اس کی موت تو بنگال کی تہذیب وثقافت کی موت ہوگی۔''[۹] ناول ''اللہ میگھ دے'' کا ایک کردار بنگلہ کو بنگال کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا ایک ایسا ثقافتی ورثہ قرار دیتا ہے جو چھ صدیوں تک ان کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی، جس کا خمیر وہاں کے سبزہ زاروں اور دریاؤں کی لہروں سے اٹھا اور جس میں دھان کی خوش بو اور مچھلی کی باس پائی جاتی تھی۔[۱۰] مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے اس حقیقت کے ادراک میں بہت دیر لگا دی اور جب اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان کا درجہ ملا تو بہت کچھ گنوایا جا چکا تھا۔ اس وقت تک اہلِ بنگال ایک ایسی ڈگر پر چل چکے تھے جس نے انھیں قومی دھارے سے الگ کر دیا۔ طارق محمود ''اللہ میگھ دے'' میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''مایوسی کی عجیب فضا میں بنگالیوں نے اپنی زبان کی گہرائیوں سے روحانی رشتہ مضبوط کیا اور پھر اس ڈگر نے انھیں قومی سطح کی سوچ سے قدرے بیگانہ کر دیا۔''[۱۱]

سقوطِ ڈھاکہ کے مسئلے پر لکھے گئے اکثر ناولوں میں اس لسانی پہلو کا تذکرہ ملتا ہے۔ ناول نگاروں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر آغاز میں ہی بنگلہ کو قومی زبان کا درجہ دے دیا جاتا اور اردو کو بزورِ بازو بنگالیوں پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جاتی تو دونوں حصوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو روکا جا سکتا تھا۔

ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی زبان کے اس مسئلے کو اپنا موضوع بنایا ہے تاہم ناول کی نسبت افسانوں میں اس پہلو کو نسبتاً کم توجہ حاصل ہو سکی ہے۔ اس ضمن میں قیصر قیصری کا افسانہ ''تھوتھو'' قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے لسانی تعصب سے ہٹ کر ''وطنیت کے جذبے کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور مشاہدے کی گہرائی، جزئیات کی داخلی تدوین اور احساس کی شدت کا ثبوت دیا ہے۔''[۱۲] انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کو ماننے والے محض اس بات پر ایک دوسرے کے جانی دشمن بن بیٹھے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کی زبان نہیں بولتا۔ غلام محمد نے لسانی بنیادوں پر ہونے والی قتل وغارت سے اپنی نفرت کا اظہار افسانے ''ترکِ وفا'' کے ذریعے کیا ہے افسانے کا ایک کردار کتوں کو اس لیے انسانوں سے بہتر قرار دیتا ہے کہ نہ تو ان کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور نہ اس مسئلے پر ان کے درمیان فسادات جنم لیتے ہیں۔ اختر جمال نے

افسانے ''دوسری ہجرت'' میں اس سانحے کا باعث بننے والے مختلف عوامل کا ذکر کرتے ہوئے لسانی مسئلے کو خاص اہمیت دی ہے۔انھوں نے آہستہ آہستہ بڑھتے اس لسانی تعصب کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

ناول اور افسانے کے علاوہ لسانی حوالے سے لکھی گئی تحریروں میں انور رضا کی ڈائری ''یادوں کے جھروکے'' نہایت اہم ہے۔اس ڈائری میں انھوں نے زبان کے مسئلے کا نہایت گہرا جائزہ پیش کیا ہے۔وہ ایک طویل عرصے تک بنگال کے مختلف علاقوں میں رہیں چنانچہ اس عرصے میں انھوں نے زبان کے ساتھ بنگالیوں کی گہری محبت کو محسوس کیا اور اسے ڈائری کا حصہ بنایا[۱۳] ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ سے تمام تر محبت کے باوجود بنگالیوں کے دلوں میں اردو سے کسی قسم کا کوئی تعصب نہ پایا جاتا تھا مگر غیر بنگالیوں کا خود کو بنگلہ سے الگ رکھنے اور حکومتِ وقت کا اردو داں طبقے کو اہمیت دینے کے باعث بنگالیوں میں آہستہ آہستہ لسانی تعصب جنم لینے لگا۔مصنفہ کے خیال میں غیر بنگالیوں کا خود کو بنگلہ سے نابلد رکھنا، خود کو برتر سمجھنا اور اردو کو بنگالیوں پر ٹھونسنے کی کوششوں نے دونوں حصوں کے درمیان گہری خلیج پیدا کر دی جو وقت کے ساتھ بڑھتی چلی گئی اور دشمن نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

> ''ان دونوں وجوہات کو برسرِ اقتدار حضرات نے کوئی اہمیت نہ دی مگر تصورِ پاکستان کے مخالفوں نے ان کی اہمیت کو خوب سمجھا اور ان کو ترتیب سے بساط بنا کر ایسے مہرے چلے کہ بازی کا رخ ہی بدل دیا۔شرم، اجنبیت اور نادانی نے جو بنگالی اور غیر بنگالی پاکستانیوں میں ایک حجاب سا حائل کیا تھا، اسے اس طرح ہوا دی کہ وہ ایک خلیج کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔''[۱۴]

باقی ڈائریوں، رپورتاژوں یا خطوط میں چونکہ سقوطِ ڈھاکہ کے آخری دنوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اس لیے ان میں لسانی مسئلے سے ہٹ کر آخری دنوں کی روداد پر زور دیا گیا ہے۔

بنگالیوں کے اندر زبان کے مسئلے سے پیدا ہونے والا احساسِ محرومی اس وقت مزید بڑھتا چلا گیا جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ حکومت کے معاملات میں ان کا قابلِ ذکر کردار نہیں ہے۔خصوصاً ۱۹۵۳ء میں جب گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو اس سے بنگالی اور زیادہ ناراض ہو گئے اور انھوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا[۱۵] بعد ازاں جنرل ایوب خان کے مارشل لا نے ان کی سیاسی محرومی کے احساس کو شدید تر کر دیا۔ ہمارے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں مختلف کرداروں کے ذریعے اس صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ اگر ملک میں جمہوریت کا سلسلہ جاری رہتا تو بنگالیوں کے احساسِ محرومی میں کمی کی جا سکتی تھی۔مگر ان چوبیس سالوں میں انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اس اندازِ حکمرانی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ناول نگاروں نے ناولوں کے مختلف کرداروں کے ذریعے بنگالیوں کے جذبات و احساسات کی خوب صورت عکاسی کی

ہے۔''بائیس سالوں نے ہمیں کیا دیا۔اقتصادی بدحالی، سیاسی حق سے محرومی، فوجی آمریت کے شکنجے، نوکر شاہی...... یہاں تو حقائق اتنے کڑوے ہیں کہ زندگی تلخ ہوکر رہ گئی ہے۔''۱۶

سلمٰی اعوان کے ناول ''تنہا'' کا ایک کردار اجتبیٰ الرحمٰن بنگالیوں کی اس سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''حالات جس نہج پر رواں ہیں یوں لگتا ہے کہ بنگالیوں کی اکثریت، ان کی بُو دو باش کو کبھی بھی ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ بنگالی اپنی اکثریت کے باوجود بھی شریکِ اقتدار نہ ہو پائیں گے اور اگر کسی مرحلہ پر جمہوریت کی فضا میں اپنے حقوق کے حصول کے قریب پہنچ بھی گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ ہماری راہ میں روڑے اٹکائے جائیں گے۔''۱۷

قیامِ پاکستان کے بعد اگر جمہوریت کا سلسلہ جاری رہتا اور اکثریتی پارٹی کو حکومت کی ذمہ داری ادا کرنے دی جاتی تو حالات اس نہج پر نہ پہنچ پاتے۔ ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کا ایک کردار مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔''پاکستان بننے کے بعد اکثریت میں ہونے کے وجہ سے حکومت کا حق ان کا تھا۔ آپ نے وہ حق انھیں نہیں دیا تو انھوں نے دوسرا حق استعمال کیا۔''۱۸ غلام محمد اپنے افسانے ''تین مسافر'' میں ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے ۱۹۶۹ء کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

> ''یہ اس ٹرین کی کہانی ہے جو ۲۲ برسوں سے چل رہی ہے اور اسٹیشن نظر نہیں آتا۔ کچھ لوگ اس ٹرین میں ایسے سوار ہوئے کہ چشم زدن میں ہر شے پر قابض ہو گئے۔ ٹرین ان کی مرضی کے مطابق چلتی ہے۔ دوسرے مسافران کے لیے محکوم کا درجہ رکھتے ہیں۔''۱۹

اس افسانے میں وہ یہی واضح کرتے ہیں کہ مغربی پاکستانی حکمرانوں نے معیشت اور حکومت سمیت کسی بھی معاملے میں بنگالیوں کو اہمیت نہ دی۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے اکثر افسانے مختصر زمانی کینوس کے باعث ان طویل مسائل پر توجہ دیتے نظر نہیں آتے البتہ دیگر تحریروں میں مسعود مفتی کی رپورتاژ ''ہم نفس'' قابلِ ذکر ہے۔ جس میں وہ حال کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ماضی میں بھی جھانک لیتے ہیں اور حال کے لمحے کا سبب ماضی کے واقعات میں تلاش کرتے ہیں۔

> ''پاکستان کی تواریخ کے تمام المیے اس ایک رویے سے پھوٹے ہیں کہ قائداعظم کے بعد جو بھی حاکم آیا اس کا واحد مقصد اپنا دائمی اقتدار رہا ہے۔ یہی خواہشِ اول، یہی خواہشِ آخر۔ اس ہوس نے برسوں ملک کا دستور نہ بننے دیا۔ بنا تو اس پر عمل نہ ہونے دیا۔ جمہوریت کو تہِ تیغ کیا۔ عوام کو دانستہ تعلیم سے محروم رکھا اور ایک صحت مند ملک کو بیمار جاگیر کا درجہ دے دیا۔ اتنے

مختلف حاکم سب کا رویہ واحد۔ حاکموں کا اگر یہ رویہ نہ ہوتا تو وطن عزیز کی تواریخ مختلف ہوتی۔''[20]

انور رضا ''یادوں کے جھروکے'' میں سیاسی حوالے سے ایوب خان کے بنیادی جمہوریت کے تصور کے بارے میں بنگالیوں کے تحفظات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''سیاسی سطح پر بنگالی اپنی نمایندگی سے بہت خفا تھے...... بنیادی جمہوریت کا تصور وضع کیا گیا۔ اس میں بنگال کے نمایندے اس طرح شامل ہوئے کہ ان کی ذاتی رائے یا تو تھی نہیں یا عسکری رعب و دبدبے نے ان میں صریحاً اظہار کا حوصلہ ہی نہ رہنے دیا۔ جو کچھ بھی تھا، صحیح یا غلط، مگر بنگالی اس سیاسی نمایندگی کو کٹھ پتلیوں کا تماشا کہا کرتے تھے اور بنگالی کا سیاسی طور پر بیدار شعور اس سے بے حد غیر مطمئن تھا۔''[21]

اس سیاسی عدم اطمینان کا نتیجہ تھا کہ جب مجیب الرحمٰن نے علاحدگی کا نعرہ لگایا تو لوگوں کی ایک خاص تعداد ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا ایک بڑا سبب وہاں کی معاشی بدحالی تھی۔ بنگال کی معاشی بدحالی کے کئی پہلو تھے۔ اول یہ کہ قیامِ پاکستان کے وقت ان لوگوں نے اپنی توقعات بہت بڑھالی تھیں کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے حالات یکسر بدل جائیں گے مگر ایسا ممکن نہ تھا، پھر یہ کہ وہاں کی معاشی بدحالی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا اور اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی پاکستان پر ڈال دی گئی اور تیسرا پہلو یہ تھا کہ بجٹ میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے واضح فرق نے لوگوں کے احساسِ محرومی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور مشرقی پاکستان کے لوگ اپنی تمام تر محرومیوں کا ذمہ دار مغربی پاکستانیوں کو گرداننے لگے اور انھیں اپنی خوشحالی کا واحد رستہ مغربی پاکستان سے علاحدگی میں نظر آنے لگا۔ ہمارے ناول نگاروں نے اس معاشی صورتِ حال کا تینوں پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ ''ماتمِ شہرِ آرزو'' کا رحمان اپنی غربت کا رونا روتا اور جی بھر کر مغربی پاکستان کے باشندوں کو کوستا جو بقول اس کے بنگالیوں کی مفلوک الحالی کا باعث تھے۔[22] ناول ''اللہ میگھ دے'' کا کردار قیوم مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان معاشی ناہمواریوں کو نوآبادیاتی نظام کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

''بات افراد کی نہیں نظام کی ہے۔ اگر ہم سو برس بھی برسرِ پیکار رہیں تو اقتصادی اور معاشی ناہمواری کا خاتمہ کسی طور نظر نہیں آتا۔ یہ فرسودہ نوآبادیاتی نظام کا منطقی نتیجہ ہے۔''[23]

ناول کی طرح افسانوں میں بھی اس مسئلے کا تذکرہ ملتا ہے۔ غلام محمد کے افسانے ''تین مسافر'' کا مرکزی

موضوع بھی یہی تفاوت ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کو ریل کے ایک ایسے ڈبے سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے مسافروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور جس کے وسائل بھی دوسرے حصے سے زیادہ ہیں مگر اس کے باوجود اس کے مسافر معاشی بدحالی میں مبتلا کر دیے گئے ہیں۔ وہ افسانے کے آغاز میں ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے پاکستان کو ایک ایسی ریل سے تشبیہ دیتے ہیں جس کے ڈبے باہم مربوط نہیں۔ وہ مشرقی پاکستان کو اس ریل کا ایسا آخری ڈبہ قرار دیتے ہیں جو ''عجیب شکل میں تھا۔ وہی سب سے بڑا ڈبہ تھا۔ اس میں کھانے پینے کے سامان موجود تھے مگر اسی ڈبے کے لوگ ایک ایک دانہ چاول اور ایک ایک قطرہ پانی کے لیے تراہ تراہ کر رہے تھے''۔[۲۴] صدیق سالک اپنی کتاب ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں بھی بنگالیوں کے انھی خیالات اور جذبات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کی دولت پر ترقی کر رہا ہے مگر مشرقی پاکستان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔

> ''تجارتی حلقوں میں مسٹر رحمٰن، مسٹر احمد اور مسٹر بھوئیاں اور چند دوسرے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا زورِ بیان اس بات پر ٹوٹتا تھا کہ جناب مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے، مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ عوامی لیگ کی زیرِ سرپرستی چھپنے والے لٹریچر کا اکثر حوالہ دیتے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے مگر اس پر قومی آمدنی کا صرف بیس فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف چالیس فیصد کماتا ہے مگر کل آمدنی کا پچھتر فیصد کھا جاتا ہے۔''[۲۵]

معیشت کے میدان میں واضح تفاوت نے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا جس کا ادیبوں نے مختلف پیرایوں میں تذکرہ کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستانیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں مغربی پاکستان کے افسران نے بھی اہم کردار ادا کیا جنھیں وہاں تعینات کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کی سول سروس میں بنگالی افسران کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جس کے سبب ایک طویل عرصے تک وہاں نظم و نسق سنبھالنے کے لیے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران متعین کیے جاتے رہے مگر ان مغربی پاکستانی افسران نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک روا نہ رکھا بلکہ ''مقامی آبادی سے ان کا رویہ مغائرت پر مبنی تھا اور اس امر کی غمازی کرتا تھا جیسے بنگالی ان کے ہم وطن ہونے کے بجائے کسی دوسری قوم کے باشندے ہیں''۔[۲۶] سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی اکثر تحریروں میں ادیبوں نے اس اہم عنصر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بنگالیوں میں احساسِ محرومی بڑھانے اور ان کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں ان افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ناول ''تنہا'' کا کردار مجتبیٰ الرحمٰن

اپنے دادا کی بیماری کے لیے ایک افسر کے پاس مدد کے لیے جاتا ہے تو اس کے آرام میں خلل ڈالنے کے الزام میں تشدد کا نشانہ بن جاتا ہے۔ بے عزتی اور تشدد سہنے کے بعد وہ اپنے دادا سے پوچھتا ہے کہ دادا! کیا تو نے اس پاکستان کی تمنا کی تھی!؟[۲۷] ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کا ایک کردار بنگالیوں کے ساتھ مغربی پاکستانی افسران کے رویے کو ویسا ہی قرار دیتا ہے جیسا انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ تھا۔ مغربی پاکستانی افسران کا یہ رویہ قیامِ پاکستان کے آغاز کے دنوں میں ایسا نہ تھا بلکہ مسعود مفتی کے بقول:

> ''وہ یک جہتی، یگانگت اور اپنائیت کا دور تھا جس میں مشرق اور مغرب والے ایک دوسرے کو اپنے اپنے خطے کے لطیفے سناتے، روایات بتاتے، رسوم پر بحث کرتے اور پھر ان میں مشترکہ پہلوؤں کا ذکر کرتے۔''[۲۸]

مگر رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلی آتی گئی اور ''حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ مشرقی پاکستانی دوستوں کی باتوں میں احساسِ محرومی جھلکنے لگا۔ نہ کہنے کے باوجود یوں لگتا جیسے زبانِ حال سے گویا ہوں: یہ خطہ ہمارا ہے۔ تم کیوں ہمارا حق غصب کرنے یہاں بیٹھے ہو۔ اور یہ مغربی پاکستانی افسران جو خوشی سے وہاں نہیں گئے تھے بلکہ ملازمت کے ہاتھوں یوں مجبور ہو چکے تھے کہ نہ مرکز میں کوئی پُرسانِ حال تھا اور نہ جائے ملازمت پر کوئی حق باقی نظر آ رہا تھا۔''[۲۹]

مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا ایک بڑا سبب تعلیمی میدان میں ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ تعلیمی اداروں میں اکثریت ہندو اساتذہ کی تھی اور اکثر تعلیمی ادارے ہندو سرمایہ داروں کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ یہ ہندو اساتذہ بنگالیوں اور ہندوؤں کو ایک تہذیبی رشتے میں پرو کر طلبا کے سامنے پیش کرتے اور مغربی پاکستانیوں کے خلاف نفرت پیدا کرتے۔ بدقسمتی سے قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم بدلنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی چنانچہ ہندوؤں کو پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۷۱ء تک ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جس نے علاحدگی کی تحریک میں ہراول دستے کا کام سرانجام دیا۔ ناول ''اللہ میگھ دے'' کا ماحول ڈھاکہ یونیورسٹی کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے مصنف طارق محمود نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کیا اور بعد ازاں وہیں سے ایم۔ اے کیا۔ اس ناول میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے حوالے سے ان کے بیان کردہ حالات و واقعات، ان کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں چھاترو لیگ کے ایک جلسے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس جلسے میں کی جانے والی تقریر سے طلبا کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> ''ہمارے منہ سے نوالہ چھیننے والو! ہم تمہارے منہ سے نوالے اگلوائیں گے۔ سونار بنگلہ کی دولت لوٹنے والو! تمہارے حساب کے دن قریب ہیں۔ بنگال کی قسمت سے کھیلنے والو!

تمہارے جاہ کی بنیاد ہمارے خون پر رکھی گئی ہے۔ اب یہ جوش کھا رہا ہے۔ بھوک اور افلاس اب ہمارا مقدر نہیں۔ بنگال جاگ اٹھا ہے۔''[۳۱]

اسی طرح ناول ''تنہا'' کی مصنفہ نے بھی مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کا خود مشاہدہ کیا۔ انھوں نے بھی اس ناول میں یونی ورسٹی کی فضا کا احاطہ کیا ہے جس کے ذریعے قاری نوجوان نسل کے جذبات واحساسات اور تعلیمی اداروں میں علاحدگی پسند عناصر کے اثرات سے بہ خوبی آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مسعود مفتی مشرقی پاکستان کے آخری دنوں میں وہاں بطور سیکرٹری تعلیم متعین تھے۔ انھیں اس حوالے سے وہاں نت نئے تجربات سے واسطہ پڑتا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں تعلیم کی صورتِ حال کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی آزادی اور فتح کے بعد ہم کاہل بن کر رہ گئے اور ہم نے نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ''جب ہم نے اپنے بچوں کی انگلی چھوڑ دی تو دوسروں نے تھام لی اور قدم قدم اپنے ساتھ چلانے لگے۔ بالآخر ادھر لے گئے جدھر وہ لے جانا چاہتے تھے۔''[۳۲] تعلیم کے میدان میں حکومتی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان میں ایک بھی سرکاری پرائمری سکول نہ تھا۔ پرائیویٹ سکول حکومت سے گرانٹ تو لیتے تھے مگر سٹاف اپنی مرضی کا رکھتے تھے جن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اساتذہ اور نصاب دونوں پر ہندوؤں کا غلبہ تھا مگر حکومت نے اس معاملے کی نزاکت کو مسلسل نظر انداز کیے رکھا جس کا نتیجہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صورت میں سامنے آیا۔ مسعود مفتی اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''نظامِ تعلیم ایک خاص رُخ میں چلنے والی ہوا ہے جس کے رخ کا تعین ہر قوم کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں تساہل کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا چوبیس برس تک پاکستان کے مخالف رخ میں چلتی رہی اور نئی نسل کے ننھے پودوں کے گرد آہستہ آہستہ دیو قیامت پہاڑ بن گئے جن کی ڈھلانیں ایسے تھیں جیسے کوئی پاکستان سے روٹھ کر اپنی پیٹھ موڑ لے۔''[۳۳]

سیاسی، معاشی، لسانی اور دیگر حوالوں سے جنم لینے والی دوریوں کی خلیج آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حالات اس نہج تک جا پہنچے جب اہلِ نظر یہ محسوس کرنے لگے کہ اب مشرقی اور مغربی حصوں کا متحد رہنا ممکن نہیں رہا۔ ۱۹۶۶ء میں مجیب الرحمٰن نے چھے نکات کا اعلان کر دیا جو علاحدگی کی دستاویز کے سوا کچھ نہ تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اگرتلہ سازش کیس سامنے آیا۔ پھر علاحدگی پسند عناصر کی طرف سے جلسے، جلوس اور ہڑتالوں کا سلسلہ روز کا معمول بن گیا۔ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' میں اس بدلتے سیاسی منظرنامے کو خاصی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا ایک کردار مکل ایک موقع پر اپنی تقریر میں کہتا ہے۔

''بعض اوقات جے بنگلہ کے ساتھ جے پاکستان کے نعرے بھی سننے میں آتے ہیں۔ اب ان

نعروں کا وقت گزر چکا ہے۔ایسے نعرے فی الفور بند کیے جائیں۔''منگل کی تقریر پر بے پناہ تالیاں بجیں اور فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔''۳۴؎

ان حالات میں جنرل ایوب خان کو اقتدار چھوڑ کر جانا پڑا تو جنرل یحییٰ خان نے ۱۹۷۰ء میں انتخابات کرائے۔یہ انتخابات پچھلے چوبیس سالوں میں بوئی گئی فصل کے نتائج کے طور پر سامنے آئے اور انھوں نے دونوں حصوں کے درمیان خلیج کو واضح صورت دے دی۔مغائرت کی فضا میں منعقد ہونے والے انتخابات کے نتائج مشرقی پاکستانیوں کی سوچ اور فکر کا آئینہ بن کر سامنے آئے طارق اسماعیل ساگر اپنے ناول ''کمانڈو'' میں ان انتخابات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''انتخابات ہو چکے تھے اور حسبِ توقع کامیابی نے علاحدگی پسندوں کے قدم چومے تھے۔ نفرت کی فصل پک کر کٹنے کی منتظر تھی۔''سنگرام۔سنگرام''،''امارادیش۔بنگلہ دیش''،''امار نیتا۔ بنگلہ بندھو''اور اس قسم کے دوسرے سفاکانہ نعروں سے شہر کے درودیوار لرزنے لگے۔''۳۵؎

سیاسی قیادت حالات کی نزاکت کو سمجھنے میں ناکام رہی اور بار بار اجلاس ملتوی کر کے بنگالیوں کے غم و غصے میں اضافہ کیا جاتا رہا۔اس عرصے میں مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی گئی۔حتیٰ کہ نوبت ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے فوجی ایکشن تک جا پہنچی۔''صدیوں کی زنجیر'' کا ایک کردار اس دن کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''یہ دو دن ظاہر کے بہت بے چینی میں گزرے تھے اور آج کی رات تو قیامت تھی کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ جیسے ہی صدرِ پاکستان کا طیارہ کراچی کی حدود میں داخل ہوگا۔ڈھاکہ میں فوجی کاروائی شروع ہو جائے گی۔''۳۶؎

اس فوجی آپریشن کے نتیجے میں پاکستانی فوج کو ظالم، غاصب اور قاتل تصور کیا جانے لگا۔ذرائع ابلاغ میں بڑھ چڑھ کر اس مسئلے کو ابھارا گیا اور جھوٹ کا سہارا لے کر پاکستانی افواج کو خوب بدنام کیا گیا۔اس طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں کہ فوجی مقامی لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹتے چلے آرہے ہیں،لوگوں کے گھروں کو نذرِ آتش کر رہے ہیں اور عورتوں کی عزتوں سے کھیل رہے ہیں۔جیون خان اپنے ناول ''دیپتی'' میں ان حالات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''آنے والے دنوں میں سرکاری فوجوں کی آمد آمد کا غلغلہ رہا۔افواہ سازوں نے باور کرایا کہ پنجابی بڑی رفتار سے بڑھتے اور مقامی آبادی کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے چلے آرہے ہیں۔ جہاں مزاحمت ہوتی ہے وہاں توپ کے دہانے کھول دیتے ہیں۔بے حساب لوگ روئی کے گالوں کی طرح دھنکے جاتے ہیں۔گھروں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔''۳۷؎

جیون خان اسی حوالے سے آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ''افواہیں وبا کی طرح پھیلتی گئیں۔ ان کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے باور کرلیا کہ فوج کے روپ میں انسان نہیں خونخوار بھیڑیے بڑھے چلے آرہے ہیں۔'' ۳۸؎

ان افواہوں کے ذریعے پاکستانی فوج کے خلاف نفرت پیدا کی گئی تاہم یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور اب یہ بات ایک حقیقت بن چکی ہے کہ آپریشن کے دوران پاکستانی فوجیوں سے بھی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جو بدنامی کا باعث بنیں۔ طارق اسماعیل ساگر ناول ''کمانڈو'' میں اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ایک پاکستانی ہونے کے ناطے مجھے احساس تھا کہ ان حالات میں یہ آپریشن ناگزیر تھا۔ فاسد مادہ الگ کیے بغیر، چیر پھاڑ کیے بغیر جسم کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ نشتر ضرورت سے زیادہ ہی گہرا چلا گیا تھا۔ جانے عملِ جراحت کی باریکیاں کیسے نظرانداز کر دی گئیں۔'' ۳۹؎

ناول نگاروں کی طرح افسانہ نگاروں نے بھی اپنے اپنے انداز میں ۲۵ مارچ کی فوجی کاروائی کا تذکرہ کیا ہے۔ غلام محمد اپنے افسانے ''بکرم پور ہاؤس'' میں اسے ایسی قیامت کی رات قرار دیتے ہیں جب شہروں کو میدانِ جنگ میں تبدیل کر دیا گیا۔

> ''پھر وہ قیامت کی رات آئی۔ لوگ محوِ خواب تھے۔ اچانک زبردست دھماکے ہوئے اور گولیاں چلنے لگیں اور چشمِ زدن میں شہر جیسے میدانِ جنگ بن گئے۔ قیاس آرائیوں میں رات کا باقی حصہ گزر گیا۔ لوگوں کے اندر غم و غصے کا یہ حال تھا کہ خوف نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔ صبح ریڈیو پر خبریں سن کر لوگ سکتے میں آگئے۔ شہر رات بھر آگ اور خون کی لپیٹ میں تھا۔'' ۴۰؎

مسعود مفتی نے ۲۵ مارچ کی رات کے موقع پر ایک خوب صورت افسانہ ''نیند'' تخلیق کیا جس میں اس آدمی کی بے بسی کا ذکر کیا گیا ہے جو پاکستانی فوج اور مکتی باہنی کے درمیان پس رہا تھا۔ یہ اس آدمی کی کہانی ہے جسے شہر کے ہنگاموں اور خوف و ہراس کے باعث عرصے سے سکون کی نیند میسر نہیں آئی۔ مکتی باہنی والے بار بار اس کے دروازے پر دستک دے کر اسے اٹھا دیتے ہیں اور وہ اندر ہی سے ''جے بنگلہ'' کا نعرہ لگا کر ان سے جان چھڑا لیتا ہے۔ مگر ۲۵ مارچ کی رات جب اس نے یہی نعرہ لگایا تو اس پر انکشاف ہوا کہ باہر پاکستانی فوجی کھڑے ہیں جو ''جے بنگلہ'' کا نعرہ سن کر اسے گولی سے اڑا دیتے ہیں۔ مسعود مفتی کا افسانہ ''باغی'' بھی مارچ کے انھی دنوں کی عکاسی کرتا ہے جس میں ایک بوڑھا شخص پیٹ کی خاطر بنگلہ دیش کے جھنڈے بیچتا نظر آتا ہے مگر اسے باغی تصور کر کے پکڑ لیا جاتا ہے۔ مسعود مفتی نے اس افسانے میں غربت، بھوک، بے یقینی اور خوف و ہراس کی فضا کی بہترین عکاسی کی ہے۔ مسعود اشعر کے افسانے ''اپنی اپنی سچائیاں'' میں بھی ۲۵ مارچ کے حوالے سے حقائق کا وہ رخ پیش کیا گیا ہے جو پاکستانی فوج کے لیے شرمناک باب

کی حیثیت رکھتا ہے۔

> ''رات کو توپوں کی گھن گرج میں وہ آئے اور کہنے لگے ''اپنے مرد ہمارے حوالے کر دو۔ سارے مرد ہمارے ساتھ آ جائیں۔'' میں نے کہا ''یہ میرا بیٹا تو مرد نہیں ہے، بچہ ہے۔'' مگر انھوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میری بات نہیں سمجھے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔
>
> ''تم بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔''
>
> ''میں یہاں سے کہاں جا سکتی ہوں! مگر تم لوگ یہ تو دیکھو۔۔۔۔۔''
>
> ''ہم سب کچھ دیکھ لیں گے'' انھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ ''تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔'' میں سامنے سے ہٹنے کا مطلب نہیں سمجھی تھی مگر جب وہ میری بیٹی کی طرف بڑھے تو ان کا مطلب سمجھ گئی اور آگے بڑھی۔ ''یہ تو میری بیٹی ہے۔ یہ تمھاری بیٹی ہے۔ یہ تو مرد نہیں ہے۔''
>
> ''بیٹی؟ کس کی بیٹی؟ ان کی آنکھیں سادہ کاغذ کی طرح بالکل سفید تھیں اور پھر زمین کی کوکھ ننگی ہو گئی۔ میری بیٹی اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے ننگی ہو گئی۔''[۴۱]

اس فوجی کارروائی کے نتیجے میں علاحدگی پسندوں کی بڑی تعداد یا تو زیرِ زمین چلی گئی یا پھر بھارت فرار ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کے بیشتر حصے کا کنٹرول پاکستانی فوج نے سنبھال لیا جس کے باعث وقتی طور پر امن وسکون محسوس کیا جانے لگا۔ کچھ عرصے بعد صدرِ پاکستان نے شر پسندوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان کی تاریخ کے اس واقعے کو بھی ادیبوں نے اپنی تحریروں میں سمیٹ لیا اور اس حوالے سے کرداروں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مسعود مفتی نے اسے ایک ایسا مفید قدم قرار دیا جو دیر سے اٹھائے جانے کے باعث فائدے کی بجائے نقصان کا باعث بنا۔ افسانے ''خوش قسمتی'' کا ایک کردار اس اعلان کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''یہ اعلان دو تین ماہ پہلے نہیں آ سکتا تھا کہ سبھی لوگ واپس آ جاتے؟ اب جو وہاں مجبوری سے رہے تو وہ ہندوستان سے گوریلوں کی تربیت لیتے رہے۔ اب یہ ٹریننگ مکمل ہوئی ہے تو آپ نے عام معافی دے کر سرحدیں کھول دیں، دھڑا دھڑ آئیں گے ان کے تربیت یافتہ گوریلے۔''[۴۲]

حکومت نے عام معافی کا اعلان یہ سوچ کر کیا تھا کہ شر پسند عناصر کو ایک بار پھر قومی دھارے میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے مگر بدقسمتی سے اس کے نتیجے میں علاحدگی پسندوں کی بڑی تعداد، جو اس عرصے میں بھارت میں کمانڈو ٹریننگ حاصل کر چکی تھی، واپس آ گئی اور ملک دشمن سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ ایسے افراد جو متحدہ پاکستان کے حامی تھے

ان غنڈہ گرد عناصر کی واپسی سے خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئے۔ مسعود مفتی کی رپورتاژ ''ہم نفس'' میں ایک ہیڈ مسٹریس عام معافی کے اس اعلان پر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''میں نے پوچھا'' کل عام معافی کا بھی اعلان ہوا ہے۔ اس کے متعلق آپ کا ردِ عمل کیا ہے؟'' کہنے لگیں ''میں تو سارا دن گھر کے اندر بیٹھ کر روتی رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے ملک چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔۔۔ مگر کہاں جاؤں۔۔۔ کل سے میرے کئی دوست یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر فیصلے اسی انداز میں ہوتے رہے تو مشرقی پاکستان نہیں بچے گا۔۔۔ پھر ہم جیسے لوگوں کا بنگلہ دیش میں کیا مستقبل ہوگا۔۔۔ کل سے سب لوگوں کی مایوسی بڑھتی جارہی ہے اور یہ تحفہ ہمیں یومِ دفاع پر دیا جارہا ہے۔''[۴۳]

عام معافی کے اس اعلان کے بعد ایک بار پھر حالات بگڑنا شروع ہوئے، تخریبی کاروائیاں بڑھ گئیں۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی جارہی تھیں، بموں کے دھماکے ایک معمول بن گیا، ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا اور لاقانونیت کا یہ سلسلہ سقوطِ ڈھاکہ تک جاری رہا۔

مارچ سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک کا یہ زمانہ، ایسا زمانہ تھا جب تمام تر انسانی اقدار کو پس پشت ڈال کر وحشیانہ کھیل کھیلا گیا۔ اس دور میں وحشت اور بربریت کی ایسی ایسی داستانیں رقم کی گئیں جن کا عام حالات میں انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں اس دور کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ جیون خان کے ناول ''دیپتی'' کا ایک کردار اس دور کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے ''یہ پاگل کتوں کا دور ہے۔ یہاں ایک ایک ذی روح کو ہزاروں مردے کاندھے پر لاد چلنا پڑتا ہے۔''[۴۴] جیون خان انتہائی موثر انداز میں اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وقت کا چیختا، چنگھاڑتا رتھ دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا، ہر لمحے جانیں تلف ہو رہی تھیں، عصمتیں لٹ رہی تھیں، رات کی تاریکی میں مکتی باہنی کے کچھ نوجوانوں کے ہاتھ گھروں میں سوئی ہوئی بنگالی لڑکیوں کے گریبانوں تک جا پہنچے۔۔۔۔۔ دیکھا کہ بھائیوں کے جسموں کی حدت بہنوں کو جھلس رہی ہے۔''[۴۵]

الطاف فاطمہ ''چلتا مسافر'' میں بڑے پیمانے پر ہونے والی قتل و غارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''قبرستان تو پھیل کر گلی محلوں تک آ گیا تھا۔ جس طرف جا نکلو، دس پانچ دھڑ، کٹے ہوئے بے شمار اعضا اور ننھے ننھے بچوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ پھر چند لوگ کھرپالیں اور بیلچے لے آتے، بڑے بڑے گڑھے کھود کر مشترکہ قبریں بنا دیتے۔''[۴۶]

مسعود مفتی کے افسانوی مجموعے ''ریزے'' کے تمام افسانے انھی دنوں کے مختلف پہلو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مسعود مفتی کے بقول اس دور میں انسان نے انسان پر جو مظالم ڈھائے، برصغیر کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ۱۹۴۷ء میں تو پھر بھی مذہب کے اختلاف نے قتل و غارت کو ایک جواز فراہم کر دیا تھا مگر ۱۹۷۱ء میں تو مسلمانوں نے مسلمانوں کے خون سے وہ ہولی کھیلی کہ انسانیت اور تہذیب کے تمام بھرم کھل کر سامنے آ گئے۔ مسعود مفتی افسانے ''صدیوں پار'' میں ان مظالم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اس کا ساتھی کافی دیر گم سم رہا۔۔۔ یہ اندر ہی اندر دہلتا رہا۔۔۔ پھر اس کے ساتھی کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں میں سے ابھری ''پہلے مردوں اور بچوں کو مارا۔۔۔ پھر عورتوں سے کہا کہ۔۔ان کی قبریں کھودو۔۔۔ وہ کھود چکیں تو۔۔۔تو۔۔۔ میمن سنگھ جیل کے دروازے کھول کر جنس کے بھوکے قیدیوں کو ان پر چھوڑ دیا گیا۔۔۔ شکاری کتوں کی طرح۔۔۔ اور پھر بعد میں ان عورتوں کو بھی۔۔۔ قتل۔۔۔'' اور اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ بالکل شل تھا۔۔۔ مگر اس کے ہونٹوں سے موہوم سی آواز نکلی۔ ''مسلمان تھے۔۔۔ مسلمان تھے۔'' [۴۷]

انتظار حسین نے افسانے ''شہر افسوس'' میں بھی اپنے مخصوص انداز میں ان فسادات کا ذکر کیا ہے۔

''اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جا نکلا۔ لاشیں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ جیتا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند، رستے سنسان، گلیاں ویران۔ کسی کسی مکان کے بالائی دریچے کے پٹ اتنے کھلتے کہ دو سہمی سہمی آنکھیں نظر آتیں اور پھر جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔ عقل حیران تھی کہ کیسا نگر ہے۔'' [۴۸]

یوں تو سانحۂ مشرقی پاکستان کے حوالے سے لکھی گئی کم تحریریں اس کشت و خوں کے تذکرے سے خالی ہیں مگر اس ضمن میں سب سے بہتر دستاویز مسعود مفتی کی ڈائری ''لمحے'' ہے۔ یہ ڈائری ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۰ جون ۱۹۷۱ء کے دنوں میں تحریر کی گئی ہے جس میں مصنف نے ذاتی تجربات و مشاہدات کے علاوہ مختلف عینی شاہدین کے بیانات بھی قلم بند کیے ہیں۔ اس ڈائری میں مسعود مفتی نے ایسے ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے کہ عام حالات میں جن کا سوچنا بھی محال نظر آتا ہے مگر مسعود مفتی کے بقول: ''ڈائری میں بیان کیے گئے واقعات، حقائق کے سامنے کچھ بھی نہیں، ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے ایسے واقعات دیکھے کہ جن کا سوچ کر بھی انسان لرز اٹھتا ہے۔'' [۴۹] ذیل میں ہم اس ڈائری سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

''چٹا گانگ میں مارچ کے شروع میں بہت تباہی ہوئی۔ میں کافی دن بعد وہ ریسٹ ہاؤس

دیکھنے گیا جو Miskah ہوٹل کے سامنے ہے اور شہر کے سترہ ذبح خانوں میں سے ایک تھا۔ ذبح خانے سے مراد وہ جگہ تھی جہاں غیر بنگالیوں کو لے جا کر قتل کیا جاتا تھا۔ وہاں فرش پر خون کی پپڑیاں جمع تھیں اور مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ نظارہ اتنا دلدوز اور وحشت انگیز تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔'' ۵۰؎

''بربریت کی ایسی ایسی کہانیاں سننے میں آئیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کسی آدمی کو گولی مارتے۔ وہ زخمی ہو کر گرتا اور کلمہ پڑھتا تو گالیاں دیتے اور کہتے ''بولو جے بنگلہ'' اگر وہ نہ بولتا تو منہ پر پیشاب کرتے، حاملہ عورتوں کے پیٹ پر کودتے کہ پہلے اندر والے کو ماریں گے پھر تمہیں ماریں گے۔ لاشوں کو رسیاں باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے رہتے۔'' ۵۱؎

''۔۔۔۔۔۔ مگر اب بھی لاشیں کھلی فضا میں گل سڑ رہی ہیں۔ ان کے کئی ایسے فوٹو لیے گئے ہیں جن میں عورتوں کی چھاتیاں کاٹی ہوئی ہیں اور پرائیویٹ حصوں کو چاقو سے پھاڑا گیا ہے۔ شیر خوار بچوں کے پیٹ آر پار کاٹے گئے ہیں اور کئی لاشیں ایسی تھیں جن کو صرف شہ رگ سے ذبح کیا گیا ہے تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر مریں۔'' ۵۲؎

مسعود مفتی کی یہ ڈائری اس نوع کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کسی بھی ادیب کا کام محض خارج کی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات قلمبند کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو انسانوں کے باطن میں اتر کر ان کے داخل کو اپنی تخلیقات کے ذریعے عیاں کرتا ہے۔ وہ خارج کی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کے باطن میں جھانکتا ہے اور وہ کچھ اپنے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آ سکتا۔ وہ حالات کے بھنور میں پھنسے ان انسانوں کے اندر جھانکتا ہے جو ان واقعات کے ذمہ دار نہیں لیکن ان وقعات کی سزا ان کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ ایسے حالات میں جب موت روزمرہ کا معمول اور زندگی خلافِ معمول ٹھہری، جب ہر انسان آنے والے لمحے کے اندر چھپی وحشتوں سے بے خبر تھا، بے یقینی کے ان دنوں میں ادیبوں نے انسانوں کے باطن میں جھانک کر ان کے جذبات و احساسات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا کہ انسان فسادات کے ان دنوں میں تہذیب و تمدن کے تمام تر لبادے اتار کر سامنے آ چکا تھا۔ انسان کے داخلی مطالعے کے حوالے سے جیون خان کا ناول ''دو پتی'' خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں ناول نگار نے انسان کی ان کیفیات کا مشاہدہ کیا اور ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کیا۔ ناول کا ایک کردار ماجد جس نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا اور حق کی فتح پر یقین رکھا، وہ بھی جب بے بس اور بے قصور لوگوں کو یوں لٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے داخل میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے اور اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔

''خالقِ کون و مکاں بھی تو انسان کو انسان کا گلا کاٹنے سے باز نہیں رکھ سکتا حالانکہ اس کا دعویٰ

ہے کہ انسان اس کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ بھلا کون خالق اپنی مخلوق کو تباہ ہوتا دیکھ سکتا ہے۔ یہ خدا بھی عجیب معمہ ہے۔ اخلاق، تہذیب، انسانیت سب جھوٹ ہے۔ اولادِ آدم خونخوار جانوروں کی ایک قسم ہے۔''[۵۳]

اسی طرح ناول کا ایک کردار مدن بھی اس دور میں ہونے والی قتل و غارت گری کو دیکھ کر ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''یہ قومیتیں، یہ سرحدیں، یہ گروہ بندیاں بے معنی ہیں، لکیر صرف ایک ہے جو انسان کو غیر انسان سے جدا کرتی ہے۔''[۵۴] جیون خان نے علاقائی اور لسانی تعصّبات کی آگ میں جلتے انسانوں کے کئی ایسے پہلو بیان کیے ہیں جو عام حالات میں کم ہی سامنے آتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کے ناول ''چلتا مسافر'' میں بھی زمین سے بچھڑے اور ہجرت در ہجرت کے تجربوں سے گزرنے والے لوگوں کا خوب صورت نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ لوگ نئی سرزمین میں اپنی جڑیں پیوست کرنے کے لیے اپنی شناخت کو بھی بدل دیتے ہیں مگر وہ سرزمین بھی انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس موقع پر ایسا ہی ایک کردار خود سے مخاطب ہو کر اپنے ماضی اور حال کے بارے میں سوچتا نظر آتا ہے۔

''ہر لمحہ آتا اور جاتا مجھے صدا دے رہا ہے۔'' اٹھ کہ وقتِ سفر آیا، وقتِ سفر، سفر، زادِ راہ اور الوداع! گھنشیام کے گھر کو بھی الوداع! گھنشیام کے اس گھر سے میرا کیا تعلق بنتا ہے؟ مزمل کو اب دماغ پر زور ڈالنا بھی شاق تھا پر ایک پھانس تھی کہ دل میں گڑی جا رہی تھی۔ رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھا اور سوال کیا، اس شہر کو اور اس شہر کو لوگوں کو میں کب جانتا تھا؟ مجھے یہاں کس نے پہچانا؟ اور میں نے یہاں آ کر کسی سے کچھ مانگا؟ مانگنا بھی کیا؟ جس کی جھولی خالی ہو وہ مانگے، میری جھولی میں میرا خواب تھا۔ میری محنتیں تھیں۔ میرے گھر کی شہادت تھی۔''[۵۵]

اسی طرح مختلف ناول نگاروں نے سقوطِ ڈھاکہ کے وقت فوجی جوانوں کی داخلی کیفیات کا بھی خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناول نگاروں کی طرح افسانہ نگاروں نے بھی اس موقع پر انسانوں کی داخلی کیفیات کا مشاہدہ کیا اور اسے افسانوں کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کیا۔ مسعود مفتی کے افسانے ''جال'' میں ایک ایسے فرد کی داخلی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے جو ''اب کیا ہو گا'' کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک ایسے کیپٹن کی کہانی ہے جو آنے والے وقت کی غیر یقینی کیفیت کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔

''اس کو تو صرف شک تھا۔۔۔ اور وہ بھی لنگڑا سا۔۔۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔۔۔ پختہ یقین۔۔۔ اس لیے کہ میں وہ خطوط پڑھ چکا تھا اور اس کے اندرونی درد سے

واقف تھا۔۔۔ذاتی المیے اور قومی المیے کا سنگم کسی بھی حساس فرد کو بھسم کر سکتا ہے۔ میں پژمردہ اور نڈھال واپس آ رہا تھا تو نہ جانے مجھے اس فوجی افسر کی بات کیوں یاد آنے لگی۔۔۔خارجی حالات اور اندرونی ذہنی کیفیت کے تانے بانے سے بنا ہوا جال۔۔جس میں انسانی زندگی کے لمحے ایسے پھنس جاتے ہیں جیسے پنچھی دام میں پھڑ پھڑاتا ہے۔''۵۶؎

اسی طرح مسعود مفتی کا افسانہ ''سپنا'' بھی اس لڑکی کی کہانی پیش کرتا ہے جس کے گھرانے کے دیگر افراد ان فسادات کی نذر ہو جاتے ہیں اور وہ اکیلی بچ جاتی ہے۔ مسعود مفتی اس لڑکی کی کہانی بیان کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

''۔۔۔۔۔۔شاید موت کی ارزانی اتنا بڑا المیہ نہ تھا جتنا مرنے والوں کے بعض پسماندگان کی کربناک زندگی تھی۔ یہ المیے جتنے تہِ خاک تھے، اس سے زیادہ برسرِ زمین تھے۔۔۔ یہ المیے گویا دکھ کے پودے تھے جن کی زیرِ زمین جڑوں سے درد کی شاخیں پھوٹ کر سطح زمین سے اوپر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس لحاظ سے اصل انقلاب تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہوتے بلکہ چلتے پھرتے افراد کے سینوں میں ہوتے ہیں۔''۵۷؎

دیگر کئی اور افسانوں میں بھی قتل و غارت، عصمت دری، ہجرت اور لوٹ مار کے جنون میں مبتلا انسانوں کی داخلی نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے تاہم اس ضمن میں مسعود مفتی کی رپورتاژ ''چہرے'' خاص اہمیت کی حامل ہے جس میں وہ ایک ادیب کی آنکھ سے لوگوں کے دلوں میں برپا طوفانوں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اس رپورتاژ میں وہ ۱۴ دسمبر ۱۷ء سے ۱۶ دسمبر ۱۷ء کے دوران ہوٹل کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں موجود لوگوں کے ایسے چہرے دیکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عام حالات میں مصلحت اور تہذیب کے نقابوں تلے چھپے رہتے ہیں۔ یہ چہرے ایسے حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ وقت نے ان کے تمام نقاب نوچ کر پھینک دیے ہیں اور انھیں ابھی یہ مہلت نہیں ملی کہ مستقبل کے لیے نئے نقاب کا انتخاب کر سکیں۔ ان چہروں کے خطوط میں جہاں تاریخ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے وہاں انسان اور اس کے باطن کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب فلسفے دم توڑ رہے تھے، انسانی ذات تنکے کا سہارا تلاش کر رہی تھی اور وسوسوں کے سائے ایمان کو دھندلا رہے تھے۔ قومی المیہ جب افراد کے آنگن میں اترتا ہے تو کیسے کیسے عذاب اپنے ہمراہ لاتا ہے اور افراد کے باطن میں کیسے کیسے طوفان برپا کرتا ہے۔ ''چہرے'' کا ایک بہاری کردار اس کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

''وہ خشمگیں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک دم بات کاٹ دیتا ہے۔ ''دیکھیے صاحب! سزا اور جزا کا مسئلہ اپنے پاس رکھیں۔ مجھے معلوم نہیں قوموں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔۔۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اپریل میں میرا دو سالہ بچہ مارا گیا۔۔۔ اور اب۔۔۔ میرا تین

ماہ کا بچہ مارا جائے گا۔۔۔ان کو کس عمل کی سزا مل رہی ہے۔۔۔اور اس عمر میں ان کے اعمال کیا ہیں؟ اگر یہ قوم کی سزا ہے تو اس کے لیے ہر دفعہ میرا ہی گھرانا کیوں چنا جاتا ہے؟۔۔۔قوم میں اور لوگ نہیں ہیں کیا؟" ۵۸

فسادات کے ان دنوں میں انسانوں پر جو گزرتی رہی، موت کی دہشت کا شکار افراد کے داخل میں جو شکست و ریخت ہوتی رہی، کسی دوسرے فرد کے اعمال کی سزا بھگتنے والے افراد کے داخل میں جیسی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی رہیں، مسعود مفتی نے اس رپورتاژ میں ان داخلی کیفیات کا خوبصورت عکس پیش کیا ہے۔

صدیق سالک کی روداد "ہمہ یاراں دوزخ" بھارتی قید کے دنوں کی کہانی بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب سقوطِ ڈھاکہ سے بھارتی قید اور پھر رہائی کے تذکرے پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے جا بجا اپنی اور دوسرے ساتھی قیدیوں کی داخلی کیفیات خوب صورت اسلوب میں بیان کی ہیں۔ قید کے دوران ایک موقع پر جب دیگر پابندیوں کے ساتھ ساتھ کھل کر رونے، ہنسنے یا گانے پر بھی پابندیاں لگا دی گئیں تو ان پابندیوں نے قیدیوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کو بالکل ہی بجھا دیا۔ صدیق سالک اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایسی ہی نت نئی پابندیوں نے اکثر احباب کی زندہ دلی کو متاثر کر دیا تھا۔ ان کی زقندیں بھرے قہقہے اب سکوت وحسرت کے پنجروں میں بند ہو گئے تھے۔ ان کی خوش دلی، خوش مذاقی اور خوش کلامی پر اوس پڑ چکی تھی۔ اب پاکستان سے تازہ کپڑوں اور خشک میووں کے پیکٹ آتے تو ہر کوئی انھیں بچھڑے ہوئے غم کی طرح سینے سے لگا لیتا کوئی شور وغل مچاتا نہ کوئی ہنگامہ برپا کرتا۔ ہفتوں خط نہ آتے تو کوئی نالہ وشیون، کوئی فریاد یا احتجاج سکوتِ قید خانہ کی دھجیاں نہ اڑاتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ ہر کوئی اب بے نیازِ بہار وخزاں دن کاٹنے کو تیار ہے۔" ۵۹

سانحۂ مشرقی پاکستان ایک ہمہ پہلو المیہ تھا۔ ہمارے مؤرخین نے جہاں اس سانحے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل کا پتا لگایا وہاں ہمارے ادیبوں نے افراد کی زندگیوں پر پڑنے والے اس سانحے کے اثرات کو اپنی تخلیقات میں محفوظ کر لیا ہے۔ مسعود مفتی کے بقول:

"ادیب کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کیا ہوا۔ ان (مؤرخین) کے لیے واقعات بنیادی اور انسان ثانوی حیثیت رکھتے ہیں مگر ادیب کے لیے انسان بنیادی اور واقعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کئی واقعات ایسے ہیں جو مؤرخ یا جرنلسٹ کے لیے اہم مگر ادیب کے لیے غیر اہم ہیں اور کئی واقعات پر مؤرخ یا جرنلسٹ کی نظر نہیں ٹھہرتی مگر وہ ادیب کے ذہن میں زلزلے اٹھا دیتے ہیں۔" ۶۰

ہمارے ادیبوں نے ایسے ہی واقعات اور ان واقعات میں مبتلا انسانوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کی داخلی کیفیات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنا کر اس سانحے کا یہ پہلو بھی محفوظ کر لیا ہے۔

ایک طرف معاشرتی سطح پر قتل و غارت گری اور لاقانونیت کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف چاروں طرف جنگ کے سائے منڈلاتے نظر آتے تھے۔ آخری مہینوں میں بھارت کی طرف سے سرحدوں کی خلاف ورزی کوئی چونکا دینے والی بات نہ تھی بلکہ یہ تو معمول کا واقعہ بن چکا تھا۔ سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی اکثر تحریریں مشرقی پاکستان کے ان دنوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ رؤف ظفر کا ناول ''ماتمِ شہرِ آرزو''، طارق اسماعیل ساگر کے ناول ''کمانڈو'' اور ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' جنگ کے ان دنوں کی مفصل کہانی بیان کرتے ہیں۔ ان ناولوں کے علاوہ دیگر ناولوں میں بھی ارتقائی صورتِ حال طے کرتے حالات، جنگ کے مختلف پہلوؤں، سقوطِ ڈھاکہ اور پھر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کی صورتِ حال کا تذکرہ بھی اس انداز میں ملتا ہے کہ حالات کی ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے ابھر کر آجاتی ہے۔ وہ نہ صرف مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کے حالات سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے بلکہ ان حالات کے منطقی انجام سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ یوں تو بھارت نے مشرقی پاکستان کی حدود کی خلاف ورزیوں کا آغاز بہت پہلے کر دیا تھا تاہم نومبر میں بڑے پیمانے پر فوجی کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ جنگ کا باقاعدہ اعلان ۳ نومبر کو کیا گیا لیکن مختلف محاذوں پر پاکستانی فوج، بھارتیوں سے برسرِ پیکار ہو چکی تھی۔ طارق اسماعیل ساگر ناول ''کمانڈو'' میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''دشمن نے دراصل ہم پر All Out حملہ ۲۱ نومبر کو کر دیا تھا اس کے بعد ۱۶ دسمبر کے سانحے تک بھارتی فوجیں کھلم کھلا میدانِ جنگ میں ہمارے خلاف لڑتی رہیں۔ یہ الگ بات کہ دنیا کو یہی بتایا گیا کہ بھارتی افواج نے کھلی جنگ ۳ دسمبر کو پاکستان کے اعلانِ جنگ کے بعد شروع کی تھی۔'' ۱۶

بھارتی فوج تعداد اور ہتھیاروں کے اعتبار سے مشرقی پاکستان میں موجود پاکستانی فوج پر بہت بھاری تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بھارتی فوج کو ملک کے اندر سے مکتی باہنی کی مسلح مدد بھی حاصل تھی۔ جب کہ اس کے مقابلے پر پاکستانی فوجی ملک کے اندر باغیوں سے لڑ لڑ کر تھک چکے تھے اور ان کے پاس جنگی سامان بھی بھارتیوں کے مقابلے میں نہایت تھوڑا تھا۔ ملک کے اندر عام لوگوں کی مخالفت، مکتی باہنی کے مسلح حملوں، تھکی ماندی فوج اور ہائی کمان کی جانب سے عدم دلچسپی کے عناصر نے جنگ سے پہلے ہی شکست کے اسباب مکمل کر دیے تھے۔ طارق اسماعیل ساگر ''لہو کا سفر'' میں لکھتے ہیں۔

> ''اکتوبر کے آخری ہفتے تک حالات ایسے ہو چکے تھے کہ ہم عملاً محصور ہو کر رہ گئے۔ مجھے ہی کیا

پاکستان آرمی کے ہر آفیسر کو احساس تھا کہ ہم اس جنگ کو طوالت دے سکتے تھے مگر جب تک باہر سے امداد نہ آئے، دشمن پر فتح حاصل کرنا ممکن نہیں۔۔۔ ہمارے فضائی اور آبی وسائل اتنے کم تھے کہ ان کے متعلق سوچنا یا ان پر انحصار کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات ہوتی۔ اکتوبر کے اواخر تک تو یہ ''ڈھکوسلہ'' بھی ختم ہو کر رہ گیا۔''٦٢

اس مخدوش ترین صورتِ حال کے باوجود، ہمارے فوجی جوانوں نے میدانِ جنگ میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، دشمن نے بھی ان کا اقرار کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کارنامے شکست کی دلدل میں ڈوب گئے۔ جذبۂ ایمانی سے لبریز، فوجی سپاہیوں نے شکست پر موت کو ترجیح دی اور میدانِ جنگ میں تمام تر بے سروسامانی کے باوجود، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑے۔ افسوس کہ شجاعت کی یہ کہانیاں مجموعی طور پر مؤرخ کی نگاہوں سے بھی اوجھل رہیں مگر ہمارے ادیبوں نے ان کی شجاعت اور بہادری کے کارناموں کو اپنی تحریروں کے ذریعے زندہ کر کے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ طارق اسماعیل ساگر فوجی جوانوں کے ان کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس لڑائی میں فلک نے مجاہدین کی عظمتوں کے وہ نظارے دیکھے جن کی نظیر تاریخ عالم میں مشکل سے دکھائی پڑتی ہے۔ یہی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیے اگر کوئی یہ کہتا ہے تو دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ یہ تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔''٦٣

طارق اسماعیل ساگر کے ناول ''کمانڈو'' کے آخری باب ''ٹوٹا ہوتارا'' میں جنگ کے واقعات کو خاصے جذباتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ ایک حوالدار ''حکم داد'' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ٹائیگر (حکم داد) اپنی کچھار سے نکل کر ایڈوانس کرتے ہوئے بھارتی فوجیوں پر لپکا۔ چشمِ فلک نے یہ نظارہ کب دیکھا ہوگا! اس کی لپک، جھپٹ پر فرشتوں نے مرحبا، مرحبا پکارا۔ یہ جنگ نہیں تھی، اس طرح جنگیں نہیں لڑی جاتیں۔ یہ تو بڑھ کر موت کو اپنانے کی ادائیں تھیں۔''٦٤

جذبۂ ایمانی سے لبریز ان فوجی جوانوں کو جب دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم ملا تو وہ لرز کر رہ گئے۔ یہ حکم سن کر وہ جس ذہنی اذیت میں مبتلا ہوئے، اسے طارق اسماعیل ساگر نے نہایت موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

''میجر صاحب نے سیٹ پر جھکتے ہی میرے ساتھ ہتھیار ڈالنے کا پیغام سنا تھا۔ ''نہیں'' وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ ریڈیو آپریٹر کی آنکھیں بھی خون اگل رہی تھیں۔ میجر صاحب نے دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا ''بوائے؟'' وہ خاموش میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

''نو سر۔'' میں نے سر کو جنبش دی۔

میجر صاحب نے پاؤں کی ٹھوکر ریڈیو کو ماری اور دشمن کی بالا دستی کا نوحہ الاپتی صدا کو موت آ گئی۔''۶۵

ناول ''دپچتی'' میں بھی فوجیوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے اس موقع کا ذکر کیا گیا ہے۔

''کرنل کی آواز ڈوب گئی۔ کچھ دیر وہ پھر سر کو تھامے بیٹھے رہے، پھر رومال سے آنکھیں صاف کیں اور لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پانی سر سے گزر چکا ہے، ہائی کمان نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔'' ماجد کا سر چکرانے لگا۔ کمرے میں ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی اور اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے شدید ضرب لگائی ہے اور وہ گرا چاہتا ہے۔ ''جاؤ بیٹے سب کو بتاؤ کہ لڑائی ختم ہو چکی ہے۔'' اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ ''لڑائی ختم ہو چکی ہے''۔۔۔ کیسے۔۔۔ کہاں۔۔۔ لڑتو ہم رہے تھے۔۔۔ محاذِ جنگ تو سرحدوں پر تھا، جہاں ہم نے انھیں گھیرے میں لے رکھا تھا تو پھر ہائی کمان نے ڈھاکہ میں ہتھیار کیوں ڈال دیے؟''۶۶

ہمارے افسانوں میں فوجی جوانوں کے کارناموں یا جنگ کے حالات کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ افسانے کا اختصار ہے، جنگ کے حالات قلم بند کرنا، ایک ایسا پہلو تھا جو قدرے طوالت کا متقاضی ہونے کے باعث افسانے میں سمیٹنا قدرے محال تھا۔ تاہم بعض افسانوں میں ۱۶ دسمبر کے المیے کا ذکر ضرور ملتا ہے مثلاً اختر جمال کے افسانے ''پسِ دیوارِ زنداں'' میں ایک کردار کے ذریعے محبِ وطن پاکستانیوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

''جب ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی تو عائشہ بت بنی رہ گئی۔ اسے ایسے لگا کہ جو گردن وہ اب تک اٹھائے کھڑی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ درد کی لہر اس کی نس نس میں تیرنے لگی۔ اس نے سارا دن کچھ نہ کھایا، نہ پیا۔ اپنے وجود کی بوجھل گٹھڑی پھینک دینے کو جی چاہا۔ وجود کا کتنا بوجھ ہے، یہ پہلی بار احساس ہوا۔ اس نے ان گنت تاروں کو بے بسی سے دیکھ کر سوچا کہ انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا سچ مچ ان ستاروں کا کھیل ہے۔''۶۷

سید ضمیر جعفری اپنی ڈائری ''جدائی کا موسم'' میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے اس سانحے کا ذکر نہایت دلدوز انداز میں کرتے ہیں جو ہر پاکستانی کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

''بھارت کی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں۔ مسجدیں خاموش ہو گئیں۔ ہمارے ٹائیگر نے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ پاکستان کے ۲۶ ہزار مجاہدین دشمن کی قید میں چلے گئے۔ پاکستان کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ مشرقی پاکستان پر ایک نئے وطن ''بنگلہ دیش'' کا پرچم لہرا دیا گیا...... آج کا دن ہماری تاریخ کا سیاہ دن ہے۔ اجتماعی اداسی کا اتنا بھیانک لمحہ ہم

پر اس سے پہلے کبھی نہیں گزرا۔ ہمارے لیے یہ شکست کا پہلا تجربہ ہے۔ لفظ میرے قلم پر سُوکھ گئے۔" ۶۸

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد عام لوگوں کی دلی کیفیت کا تذکرہ بھی سید ضمیر جعفری کی اس ڈائری میں نظر آتا ہے۔ ۱۸ دسمبر کو لکھی گئی یادداشتوں میں وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فضا میں اتنی سراسیمگی نہیں ہے، جتنا اپنی ہزیمت اور بے تدبیری پر اداسی، شرمندگی اور برہمی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس شکست سے ہماری قومی انا کو سخت دھچکا لگا ہے، جیسے ہم اس سانحے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔" ۶۹

۱۶ دسمبر کا واقعہ جہاں محبِ وطن پاکستانیوں کے لیے ایک بہت بڑے سانحے کی حیثیت رکھتا ہے وہاں علاحدگی پسند بنگالیوں کے لیے یہ دن بہت خوشی کا دن تھا۔ بعض مقامات پر تصویر کا یہ رخ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ناول "صدیوں کی زنجیر" کا ایک علاحدگی پسند کردار رونجھو اپنے بھائی شمس الرحمٰن کو پاکستان کی شکست کی خبر دیتا ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے علاحدگی پسند بنگالیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

"اس کا لہجہ خوشی سے کنول کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا" جے بنگلہ بھائی سنا تم نے آج شام ریس کورس میدان میں ہتھیار ڈالے جائیں گے، ضرور آنا، وہ چاہتا تھا کہ آواز کے ناطے ہی بھائی کے گلے لگ جائے، دونوں اتنے قہقہے لگائیں کہ آسمان سر پہ اٹھالیں۔" ۷۰

بہر حال بحیثیت پاکستانی، ہمارے ادیبوں نے یہ پہلو کم ہی بیان کیا ہے بلکہ زیادہ تر ان کا زاویہ نگاہ مایوسی کی وہ فضا رہی جو محبِ وطن پاکستانیوں کے دلی جذبات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔

یوں تو سقوطِ ڈھاکہ کے قومی المیے سے لاتعداد انسانی المیوں نے جنم لیا مگر ان میں سے ایک بہت بڑا المیہ بہاریوں کے مسئلے کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ لوگ جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر کے پاکستان پہنچے تھے، انھیں ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر اسی تجربے سے گزرنا پڑا بلکہ کئی ایک حوالوں سے ہجرت کا یہ دوسرا تجربہ پہلے تجربے سے کہیں تلخ تھا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں جان و مال اور عزت و آبرو گنوا بیٹھنے کا احساس جان لیوا تھا۔ وہ اپنے آبائی علاقے کو ۴۷ء میں خیرآباد کہہ چکے تھے، ۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے انھیں اکھاڑ پھینکا اور مغربی پاکستان نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تو یہ لوگ فضا میں معلق ہو کر رہ گئے جن کا روئے زمین پر کوئی وطن نہ تھا۔

سانحۂ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھنے والے ادیبوں نے یوں تو کسی نہ کسی حوالے سے بہاریوں کے مسئلے کا تذکرہ کیا ہے تاہم الطاف فاطمہ نے مذکورہ موضوع پر ایک مکمل ناول "چلتا مسافر" لکھ کر، ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں

فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔[۲۱] الطاف فاطمہ نے اس ناول میں بہاری مسلمانوں کی قیامِ پاکستان کے لیے جدو جہد اور آزادی کے لیے ان کی قربانیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ''یہ ان ہجرتوں کی داستان ہے جس کے پسِ پشت خلوص، قربانی اور ایثار کا وافر جذبہ موجود ہوتا ہے۔''[۲۲] الطاف فاطمہ نے ایک خاندان کی کہانی بیان کر کے ۴۷ء کی ہجرت سے لے کر ۷۱ء کی ہجرت تک کے واقعات کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

> ''یہ ایک بہاری کنبے کی کہانی ہے جو بہار میں تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرتا ہے اور نئی بہار کی تلاش میں مشرقی پاکستان کی دھرتی میں اپنی جڑیں پیوست کرتا ہے تاکہ نئے وطن کی فضاء میں بسی اپنی خوشبو بھی شامل کر سکے لیکن وہاں پاکستانی بن کر نہیں رہ سکتا، وہ تو بے ہاری ہے۔''[۲۳]

ناول کا ایک اہم کردار مدثر ہے جس کا باپ مزمل ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو جاتا ہے۔ مدثر مشرقی پاکستان میں پیدا ہوتا ہے، وہیں تعلیم حاصل کرتا ہے اور عمر کے مختلف مراحل طے کرتا ہے مگر بنگلہ دیش کی تحریک میں اسے بھی گھر بار چھوڑ کر کیمپ میں منتقل ہونا پڑتا ہے۔ اس موقع پر مدثر کے جذبات ہر بہاری کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

> ''آج میرا باپ دوسری اور میں پہلی مرتبہ اپنا گھر چھوڑ رہے ہیں۔ کیا تمام دنیا میں ایسے انقلاب آتے ہیں کہ لوگ آئے دن بے گھر ہوتے رہے ہیں یا صرف یہ ہمارا ہی مقدر ہے۔''[۲۴]

ہجرت در ہجرت کے کرب میں مبتلا مزمل، جسے کسی زمین نے بھی پناہ نہ دی، ۱۹۷۱ء میں دوسری ہجرت کے وقت جس داخلی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے، اس کا خوب صورت اظہار اس ناول میں ملتا ہے۔ زمین کا بیٹا نہ ہونے کے جرم میں ان لوگوں کو اتنی بڑی سزا دی گئی جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ طارق محمود کے ناول ''اللہ میگھ دے'' کا ایک کردار فردوسی بھی اسی کرب میں مبتلا نظر آتا ہے۔ جب اسے مشرقی پاکستان کی زمین بھی اکھاڑ پھینکتی ہے تو وہ اپنے چھوڑے ہوئے گھر کو یاد کرتا نظر آتا ہے۔ ناول نگار نے فردوسی کے حوالے سے ایک جملے میں بہاریوں کے اس کرب کو سمیٹ لیا ہے۔

> ''عجیب حادثہ ہے، وہ مجنونانہ انداز میں ہنسا، وہاں سن آف دی فیتھ (Son of the Faith) نہ تھا اور یہاں سن آف دی سائل (Son of the Soil) نہیں ہوں، وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔''[۲۵]

ناول نگاروں کی طرح ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ اختر جمال کے افسانے ''دوسری ہجرت'' کا مرکزی موضوع یہ حرماں نصیب ہیں جو ۴۷ء سے ۷۱ء تک منزل کی تلاش میں پھرتے

رہے۔ منشی سرفراز حسین کا خاندان قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو جاتا ہے مگر اے ء میں اسے ایک بار پھر اسی تجربے سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ دوسری ہجرت کے وقت یہ سوچتا ہے کہ اگر کبھی وہاں سے بھی ہجرت کرنا پڑی تو پھر کہاں جائیں گے۔ اس موقع پر ''صدمے، نقاہت اور ضعف سے منشی سرفراز حسین کے جسم پر لرزا طاری تھا، وہ سب ہوائی جہاز میں بیٹھ گئے، منشی سرفراز حسین کی بوڑھی آنکھیں حدِ افق تک دیکھتی رہیں''۔[۶] مسعود اشعر کے افسانے ''دکھ جومٹی نے دیئے'' کا مرکزی کردار بھی اسی المیے میں جکڑا نظر آتا ہے جسے بار بار اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ زمین کا بیٹا نہیں۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ جو کیڑا زمین کے ہم رنگ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ غیر محفوظ رہتا ہے۔ علی حیدر ملک کا افسانہ ''پسپائی کا آخری موڑ'' اور ابراہیم جلیس کا ''الٹی قبر'' بھی بہاریوں کے جذبات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ انتظار حسین کے افسانے ''اندھی گلی'' اور ''شہرِ افسوس'' بھی زمین سے بچھڑے ان لوگوں کے دکھوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ انتظار حسین اپنے مخصوص داستانوی انداز میں بہاریوں کی اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''پوچھا کہ اے لوگو سچ بتاؤ، تم وہی نہیں ہو جو اس بستی کو دارالامان جان کر دور سے چل کر آئے اور یہاں بسر گئے۔ انھوں نے کہا کہ اے شخص تو نے خوب پہچانا۔ ہم انھیں خانہ بربادوں کے قبیلہ سے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ خانہ بربادو تم نے دارالامان کو کیسا پایا۔ بولے کہ خدا کی قسم ہم نے اپنوں کے ظلم میں صبح کی۔ یہ سن کر میں ہنسا، وہ میرے ہنسنے پر حیران ہوئے، میں اور زور سے ہنسا، وہ اور حیران ہوئے۔ میں ہنستا چلا گیا اور وہ حیران ہوتے چلے گئے۔ پھر یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ شہرِ افسوس میں ایک شخص وارد ہوا ہے جو ہنستا ہے۔''[۷]

بہاریوں کے مسئلے کے حوالے سے مسعود مفتی کی رپورتاژ ''چہرے'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ مسعود مفتی جہاں ہوٹل میں موجود دیگر طبقات کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہ بہاریوں کے مسئلے کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ مسعود مفتی انھیں ہندو پاکستان کا ایسا مظلوم طبقہ قرار دیتے ہیں جن سے زیادہ اس خطے میں کوئی مظلوم نہیں۔ ۱۹۴۷ء میں عزیزوں کی لاشوں پر تیرتے ہوئے خون کے سمندر پار کر کے یہاں پہنچے، مارچ اپریل ۱۹۷۱ء میں برے دن دیکھے اور پھر دسمبر اے ء میں ان کے خون سے ہولی کھیلی گئی مگر اس کے باوجود یہ منزل سے دور رہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی رپورتاژ ''زندہ بہار'' میں ان خانماں بربادوں کا تذکرہ کیا ہے جو پاکستان کو اپنا خون دینے کے باوجود اس قابل بھی نہیں کہ انھیں دو وقت کی عزت کی روٹی مل سکے بلکہ یہ لوگ تو نوکری کرنے کے حق سے بھی محروم کر دیے گئے۔[۸]

بہاریوں کے مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مشرقی پاکستان میں بسنے کے باوجود ان لوگوں نے اپنے آپ کو مقامی آبادی سے الگ تھلگ رکھا اور اپنی زبان اور تمدن کو بنگالیوں سے برتر جان کر ان میں گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

''اللہ میگھ دے'' کا ایک کردار فضلو بہاریوں کے اس رویے سے شاکی نظر آتا ہے۔ اسے شکوہ ہے کہ ''بہاریوں کو یہاں آباد ہوئے لگ بھگ بیس برس سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور آج بھی محمد پور اور میر پور جیسے جزیروں میں رہ رہے ہیں''۔[۷۹] تاہم اکثر ادیبوں نے اس مسئلے کے مذکورہ پہلو کی طرف کم توجہ دی ہے بلکہ بہاریوں کے مسائل اور ان کی داخلی کیفیات کو نمایاں کیا ہے۔

سانحۂ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی اکثر تحریریں سقوطِ ڈھاکہ کے المناک انجام کے تذکرے پر اختتام پذیر ہو جاتی ہیں مگر بعض تحریروں میں اس سانحے کے فوری بعد کے حالات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کا بھارتی فوج کی قید میں جانا اور بہاریوں کا کیمپوں میں منتقل ہونا بڑے واقعات تھے۔ اول الذکر پہلو سے صدیق سالک کی روداد ''ہمہ یاراں دوزخ'' اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انھوں نے بھارتی قید کے کئی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس روداد میں جہاں قید کی اس زندگی کے خارجی پہلو کا جائزہ لیا ہے وہیں انھوں نے قیدیوں کے باطن میں جھانک کر ان کی داخلی کیفیات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسعود مفتی کے بعض افسانوں اور خطوط میں بھی قید کی صعوبتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح بعض ادیبوں نے مہاجر کیمپوں کی حالتِ زار اور وہاں مقیم لوگوں کی کیفیت کا تذکرہ بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ احمد سعدی اپنے افسانے ''سمجھوتہ'' میں ان کیمپوں کی زندگی کا دردناک عکس پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ان کیمپوں میں خوراک اور کپڑے کے مسائل کے علاوہ سب سے بڑا مسئلہ مُردوں کے کفن کا تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے، مرد اور عورتیں آئے دن مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو رہے تھے اور دوا علاج کا معقول انتظام نہ ہونے کے سبب مَر رہے تھے۔ کفن کا انتظام اہلِ خاندان کی استطاعت سے باہر تھا اس لیے ان کی تجہیز و تکفین چندہ کے پیسے سے ہو رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ چندہ دینے والے بھی مرنے والوں سے تنگ آ گئے نتیجہ کے طور پر دو دو تین تین دن تک لاشیں پڑی رہنے لگیں۔''[۸۰]

سانحۂ مشرقی پاکستان ایک ایسا سانحہ ہے جس کے بے شمار پہلو ہیں۔ یہ قومی ہزیمت کی ایک ایسی داستان ہے جس کا ایک ایک لفظ ہماری نالائقی اور کوتاہی کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ ایک ایسا انسانی المیہ ہے جس نے انسان اور انسانیت کے سارے بھرم کھول کر رکھ دیے۔ ضرورت تھی کہ اس ہمہ پہلو سانحے کی مختلف جہتوں سے آشنائی اور آیندہ ایسے واقعات سے بچنے کے لیے بہت کچھ لکھا جاتا مگر افسوس ہے کہ اس حوالے سے تخلیق کیا گیا ادب یہ تقاضے پورے کرتا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول:

> ''سقوطِ ڈھاکہ ہماری کم سن تاریخ کا جتنا بڑا سانحہ ہے اور پھر اس سانحہ نے انفرادی سطح پر جن

لاتعداد جذباتی المیوں کوجنم دیا۔ ایمانداری کی بات ہے اہلِ قلم نے ان کا پورا حق ادانہ کیا، شعرا نے تو پھر بھی نظموں کے ذریعے سے غم وغصے کے جذبات کی ترجمانی کرلی لیکن فکشن کا دامن تہی نظر آتا ہے۔''۱۸

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے بڑے قومی اور انسانی المیے کے مقابلے میں اتنا بڑا ادب تخلیق نہیں کیا گیا جسے قومی بے حسی کا نام ہی دیا جاسکتا ہے۔ حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ادیبوں نے بھی اس المیے کو بھلانے کی کوشش کی جس کے خطرناک اور دوررس نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ کچھ ادیبوں نے اس قومی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اس سانحے کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کر کے انھیں قاری کے سامنے پیش کر دیا۔

حوالہ جات

۰۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پاکستان کے تہذیبی مسائل، لاہور، ادارہ ادب وتنقید، ۱۹۷۹ء، ص ۹۲

۰۲۔ فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور، مکتبہ فنون، ۱۹۷۳ء، ص ۱۰

۰۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ادب، کلچر اور مسائل، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۸، ۲۷

۰۴۔ قیصر قیصری، نثار زبیری، نورالعین نوید، مرتبین، وطن کا قرض، کراچی، ایوان ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص ۱۳

۰۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، روایت کی اہمیت، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳ء، ص ۴۲۱

۰۶۔ احمد ہمیش، ''پاکستان میں ۷۰ء کے بعد کی نئی اردو کہانی''، اردو افسانہ، روایت اور مسائل، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۵۱۲

۰۷۔ اشفاق احمد بخاری، ''مراجعت''، لاہور، ماہ نامہ ''فنون''، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۴

۰۸۔ غلام محمد، مکتوب بنام طاہر مسعود، مطبوعہ لہو قطرہ قطرہ، کراچی، نثری ادارہ پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۹۶۲ء

۰۹۔ سلمٰی اعوان، تنہا، لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۸۱ء، ص ۸۳

۱۰۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، ملتان، مکتبہ کاروانِ ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۱

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو افسانے کی کروٹیں، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۱

۱۳۔ راقم کی انور رضا سے ایک ملاقات، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۱۲ مئی ۲۰۰۸ء

۱۴۔ انور رضا، یادوں کے جھروکے، اسلام آباد، پکٹوریل پرنٹرز، ۱۹۷۶ء، ص ۶۸

۱۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، راولپنڈی، مکتبہ سرمد،۱۹۹۲ء، ص ۲۱۶

۱۶۔ سلمٰی اعوان، تنہا، محولہ بالا ۹، ص ۱۴۸

۱۷۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۹۸

۱۸۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۹

۱۹۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، کراچی، نشری ادارہ پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۷

۲۰۔ مسعود مفتی، ہم نفس، راولپنڈی، فیروز سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۵۱

۲۱۔ انور رضا، یادوں کے جھروکے، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۴۶

۲۲۔ رؤف ظفر، ماتمِ شہرِ آرزو، لاہور، کلاسک، ۱۹۹۶ء، ص ۲۲۷

۲۳۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۹۷

۲۴۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، محولہ بالا ۱۹، ص ۱۲۸

۲۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، محولہ بالا، ص ۱۸

۲۶۔ ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، لاہور، جنگ پبلشرز، اشاعت سوم ۱۹۹۳ء، ص ۴۲

۲۷۔ سلمٰی اعوان، تنہا، محولہ بالا ۹، ص ۱۰۲

۲۸۔ مسعود مفتی، ہم نفس، محولہ بالا ۲۰، ص ۳۰

۲۹۔ انور رضا، یادوں کے جھروکے، محولہ بالا ۱۴، ص ۱۰۶

۳۰۔ راقم کی طارق محمود سے ایک ملاقات، بہ مقام لاہور، بہ تاریخ ۱۲ نومبر ۲۰۰۸ء

۳۱۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۰، ص ۳۱

۳۲۔ مسعود مفتی، ہم نفس، محولہ بالا ۲۰، ص ۸۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۸۹

۳۴۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۸، ص ۹۷

۳۵۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸

۳۶۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۸، ص ۱۰۸

۳۷۔ جیون خان، دیپتی، لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۶۶

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۹۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا ۳۵، ص ۲۴۲

۴۰۔ غلام محمد، ترشنا، نشری دائرہ پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۵

۴۱۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷۵

۴۲۔ مسعود مفتی، ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱

۴۳۔ مسعود مفتی، ہم نفس، محولہ بالا ۲۰، ص ۷۷، ۷۶

۴۴۔ جیون خان، دپتی، محولہ بالا ۳۷، ص ۱۹۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۶۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱۱

۴۷۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۴۲، ص ۶۸

۴۸۔ انتظار حسین، شہر افسوس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۶

۴۹۔ مسعود مفتی سے ایک ملاقات، بہ مقام اسلام آباد، بہ تاریخ ۲۰ نومبر ۲۰۰۶ء

۵۰۔ مسعود مفتی، لمحے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۳۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۶۴

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۳۔ جیون خان، دپتی، محولہ بالا ۳۷، ص ۲۰۷

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۵۵۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، محولہ بالا ۴۶، ص ۲۳۴

۵۶۔ مسعود مفتی، ریزے، محولہ بالا ۴۲، ص ۱۵، ۵۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۸۴

۵۸۔ مسعود مفتی، چہرے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۳۶

۵۹۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور، الفیصل، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۸

۶۰۔ مسعود مفتی، چہرے، محولہ بالا ۵۸، ص ۶، ۵

۶۱۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا ۳۵، ص ۴۸۰

۶۲۔ طارق اسماعیل ساگر، لہو کا سفر، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹۹

۶۳۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۶۴۔ طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، محولہ بالا ۵۳، ص ۵۱۳

۶۵۔ ایضاً،ص۵۱۱،۵۱۲

۶۶۔ جیون خان، دیپتی،محولہ بالا ۳۷،ص ۲۰۵

۶۷۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، لاہور، التحریر، ۱۹۸۱ء، ص ۱۶۰

۶۸۔ سید ضمیر جعفری، جدائی کا موسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲۲

۶۹۔ سید ضمیر جعفری، جدائی کا موسم، محولہ بالا ۶۸، ص ۲۲۳

۷۰۔ رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، محولہ بالا ۱۸، ص ۲۱۰،۲۰۹

۷۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، پاکستان میں اردو ادب، سال بہ سال ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۸ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱

۷۲۔ ایضاً، ص ۵۲

۷۳۔ ڈاکٹر انور سدید، بر سبیلِ تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۳

۷۴۔ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، محولہ بالا ۴۶، ص ۲۵۹

۷۵۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۹۳

۷۶۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، محولہ بالا ۶۷، ص ۵۱

۷۷۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، محولہ بالا ۴۸، ص ۲۰۶

۷۸۔ فہمیدہ ریاض، زندہ بہار، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۵۸

۷۹۔ طارق محمود، اللہ میگھ دے، محولہ بالا ۱۰، ص ۱۸۹

۸۰۔ احمد سعدی، چراغِ دودِ محفل، ڈھاکہ، شاہکار پبلشرز، س۔ن، ص ۵۲

۸۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، محولہ بالا ۷۱، ص ۵۱

کتابیات

اردو کتب

ابراہیم جلیس، منتخب تصانیف۔ابراہیم جلیس، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۹۶ء

احسن فاروقی، ڈاکٹر، ادبی تخلیق اور ناول، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء

" ناول کیا ہے، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۴۶ء

احمد رضا قصوری، اِدھر ہم، اُدھر تم، لاہور، بریٹینیکا پبلشنگ ہاؤس، س۔ن

احمد سعدی، چراغِ دُودِ محفل، ڈھاکہ، شاہکار پبلی کیشنز، س۔ن

" مٹی کی خوشبو، ڈھاکہ، شاہکار پبلی کیشنز، س۔ن

اختر جمال، زرد پتوں کا بن، لاہور، التحریر، ۱۹۸۱ء

ارتضیٰ کریم، مرتب، انتظار حسین ایک دبستان، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء

اسعد گیلانی، پورب دیش، لاہور، مکتبہ الخیر، ۱۹۷۲ء

افتخار علی شیخ، پاکستان توڑنے والے، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۷ء

الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء

امیر عبداللہ خان نیازی، جنرل، سانحۂ مشرقی پاکستان، تصویر کا دوسرا رخ، کراچی، آکسفورڈ پریس، ۲۰۰۳ء

انتظار حسین، بستی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

" شہرِ افسوس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

" قصہ کہانیاں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء

انور رضا، یادوں کے جھروکے، اسلام آباد، پکچوریل پرنٹرز، ۱۹۷۶ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

" برسبیلِ تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰

ایوب خان، جنرل، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، لاہور، آکسفورڈ پریس، س۔ن

تقی الدین حافظ، پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۵ء

توصیف احمد خان، آدھا پاکستان، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۴ء
جالبی، جمیل، ڈاکٹر، نئی تنقید، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۵ء
" ادب کلچر اور مسائل، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء
جاوید احمد صدیقی، مرتب، میں نے ہتھیار نہیں ڈالے، کراچی، شبل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء
جیون خان، دیپتی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء
زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریکِ علاحدگی کا آغاز، لاہور، نگارشات، بار دوم، ۲۰۰۵ء
رشید امجد، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، لاہور، دستاویز، ۱۹۹۳ء
" گم شدہ آواز کی دستک، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۱۹۹۷ء
" بارش کا آخری قطرہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
رضیہ فصیح احمد، صدیوں کی زنجیر، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۸ء
رؤف ظفر، ماتمِ شہرِ آرزو، لاہور، کلاسک، ۱۹۹۶ء
رئیس امروہوی، مرتب، المیہ مشرقی پاکستان، کراچی، رئیس اکیڈمی، ۱۹۷۴ء
سجاد نقوی، مرتب، ۱۹۷۸ء کے بہترین مقالات، سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، ۱۹۷۹ء
سعید الدین، مشرقی پاکستان کا زوال، لاہور، ناظر پریس، ۱۹۷۹ء
سلمیٰ اعوان، تنہا، لاہور، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۸۳ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، ادبی زاویے، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۸۴ء
" پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۸ء، لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۸ء
سلیم منصور خالد، البدر، لاہور، ادارہ مطبوعات طلبہ، ۱۹۸۵ء
سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۶۰ء
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء
شہزاد منظر، ندیا کہاں ہے تیرا دیس، کراچی، منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، راول پنڈی، مکتبہ سرمد، بار نہم ۱۹۹۲ء
صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، لاہور، الفیصل پبلشرز، ۲۰۰۲ء
صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان کیوں ٹوٹا؟، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۳ء

"   مسلم لیگ کا دورِ حکومت–۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

"   پاکستان، تاریخ وسیاست–۱۹۴۷ء–۱۹۸۸ء، لاہور، جنگ پبلشرز، ۱۹۸۹ء

صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی وفکری مطالعہ، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء

ضمیر جعفری، سید، جدائی کا موسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

ظفر پیامی، فرار، نئی دلی، ناولستان، ۱۹۸۶ء

طارق اسماعیل ساگر، کمانڈو، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۵ء

"   لہو کا سفر، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۱ء

"   وطن کی مٹی گواہ رہنا، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۹۲ء

طارق محمود، اللہ میگھ دے، ملتان، کاروانِ ادب، ۱۹۸۲ء

ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، رپورتاژ نگاری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، پاکستان کے تہذیبی مسائل، لاہور، ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۷۹ء

"   تنقیدی تجربے، لاہور، اردو دنیا، ۱۹۵۹ء

"   روایت کی اہمیت، کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۵۳ء

عبدالمغنی، پروفیسر، قرۃ العین حیدر کا فن، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۹۱ء

عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، لاہور، مکتبہ داستان، ۱۹۹۰ء

غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، کراچی، نثری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۰ء

" ترشنا، کراچی، نثری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۰ء

" لہو قطرہ قطرہ، کراچی، نثری دائرہ پاکستان، ۲۰۰۱ء

فتح محمد ملک، تحسین وتردید، راول پنڈی، اثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

"   تعصبات، لاہور، مکتبہ فنون، ۱۹۷۳ء

فہمیدہ ریاض، زندہ بہار، لاہور، دستاویز، ۱۹۹۶ء

قرۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہم سفر، لاہور، چوہدری اکیڈمی، س۔ن

"   چاندنی بیگم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰

قیصر قیصری، نثار احمد زبیری، نور العین نوید، مرتبین، وطن کا قرض، کراچی، ایوان ادبیات، ۱۹۹۱ء

گل حسن خان، جنرل، آخری کمانڈر انچیف، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ: روایت اور مسائل، لاہور، سنگ میل پبلشرز،۲۰۰۲ء

تفضّل حسین مانک میاں، متحدہ پاکستان کے بیس سال، لاہور، گوتم پبلشرز، س۔ن

محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، سونار بنگلہ، لاہور، ادارہ افکارِ نو،۱۹۷۶ء

مسعود اشعر، سارے فسانے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء

مسعود شہر یار، مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ، لاہور، کتابیات،۱۹۶۹ء

مسعود مفتی، چہرے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز،۱۹۷۴ء

" لمحے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء

" ریزے، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء

مسعود مفتی، ہم نفس، لاہور، فیروز سنز،۱۹۹۶ء

مشاق احمد وانی، ڈاکٹر، تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۲ء

معین الدین عقیل، ڈاکٹر، پاکستانی زبان وادب: مسائلِ ومناظر، لاہور، الوقار،۱۹۹۹ء

مقبول حسین، سید، کرنل، کیمپ ۴۵، راول پنڈی، حرف اکادمی،۲۰۰۵ء

مقصودہ حسین، ڈاکٹر، مسعود مفتی۔شخصیت وفن، راول پنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء

ممتاز شیریں، معیار، لاہور، نیا ادارہ،۱۹۶۳ء

منیر احمد، جنرل محمد یحیٰ خان۔شخصیت وسیاسی کردار، لاہور، نگارشات،۲۰۰۱ء

نور احمد، قائم خانی، کیپٹن، فتح گڑھ سے فرار، لاہور، مکتبہ داستان، بار ششم ۱۹۸۲ء

نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۸ء

وقار عظیم، فن اور فن کار، لاہور، اردو مرکز،۱۹۶۶ء

" فنِ افسانہ نگاری، لاہور، اردو مرکز،۱۹۶۱ء

وکیل انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، لاہور، دار الشعور، اشاعت دوم ۲۰۰۱ء

غیر مطبوعہ مقالات

اسد فیض، ڈاکٹر شہزاد منظر کی ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد،۲۰۰۳ء

امتیاز حسین، ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری، مقالہ برائے ایم فل، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
ام سلمٰی، سقوطِ ڈھاکہ کے نظریاتی اسباب، مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اسلامیات،
مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۸۹ء
بشیر احمد، سقوطِ ڈھاکہ اور اردو ناول، مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اردو
مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۹۴ء
تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء
خالد جاوید احمد، اردو شاعری پر سقوطِ ڈھاکہ کے اثرات، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول نگاری، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، شعبۂ اردو
مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۸۶ء
ظہور احمد، پاکستان میں اردو ناول ۱۹۷۰ تا ۱۹۹۰، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء
محمد فیاض، مشرقی پاکستان کی علاحدگی۔عوامل اور محرکات، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبہ مطالعہ پاکستان
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء
محمود الحسن، اردو افسانے میں پاکستانیت، مقالہ برائے ایم۔فل، شعبۂ اردو
مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔۱۹۹۸ء

ENGLISH BOOKS

Abdul Rahman Siddiqi, East Pakistan: The End Game, Karachi,
Oxford Press, 2004.
Bhutto, Zulfiqar Ali, The Great Tragedy, Karachi,
A Pakistan Peoplés Party Publication, Third Edition, 1976.
Aziz, K. K. World Powers & the 1971 Breakup of Pakistan, Lahore,

Vanguard, 2003.

Fazal-e-Muqeem Khan, Pakistan's Crisis in Leadership, Islamabad, National Book Foundation, Second Edition, 1973.

G. W. Choudhury, The Last Days of United Pakistan, London, C. Hurst and Company, 1974.

Hassan Zaheer, The Separation of East Pakistan, Karachi, Oxford Press, 1994.

Herbert Feldman, The End and Beginning of Paksitan 1969-71, London, Oxford Press, 1976

Maswani, A.M.K, Subversion in East Pakistan, Lahore, Amir Publications, 1979.

Siddiq Salik,Witness to Surrender, Karachi, Oxford Press, 1978.

Shabbir Hussain Syed, The Death Dance, Islamabad, Kamran Publishing House, 1979.

Williams, L.F. Rushbrook, The East Pakistan Tragedy, London, Tom Stacey, 1972.

Williams, L.F. Rushbrook, Pakistan Under Challenge, London, Stacey International, 1975.

استفسارات

استفسار راقم الحروف از: بیگم انور رضا (متحدہ پاکستان کے دور میں ڈھاکہ کے آخری ڈپٹی کمشنر کی بیگم اور سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر لکھی گئی ایک ڈائری کی مصنفہ)

بہ مقام B-2 آغا خان روڈ، F-6/4، اسلام آباد، بتاریخ ۱۳ فروری ۲۰۰۸ء

استفسار راقم الحروف از: جیون خان (۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں متعین مغربی پاکستانی اعلیٰ افسر اور مذکورہ موضوع پر ایک ناول کے مصنف)

بہ مقام سیکرٹریٹ آفس لاہور، بتاریخ ۱۵ مارچ ۲۰۰۶ء

استفسار راقم الحروف از: سلمیٰ اعوان (سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر لکھے گئے ایک ناول کی مصنفہ)

بہ مقام نزد جامعہ مسجد صدر، لاہور، ۸ مارچ ۲۰۰۶ء

استفسار راقم الحروف از: علمدار رضا (متحدہ پاکستان کے ڈھاکہ میں آخری ڈپٹی کمشنر)

بہ مقام B-2 آغا خان روڈ، F-6/4، اسلام آباد، بتاریخ ۱۳ فروری ۲۰۰۸ء

استفسار راقم الحروف از: طارق اسماعیل ساگر (مذکورہ موضوع پر لکھے گئے تین ناولوں کے مصنف)

بہ مقام دفتر روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، بتاریخ ۱۰ مارچ ۲۰۰۶ء

استفسار راقم الحروف از: مسعود مفتی (متحدہ پاکستان کے ڈھاکہ میں متعین سیکرٹری تعلیم اور سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر لکھی گئی متعدد تصانیف کے مصنف)

بہ مقام مکان نمبر ۴، گلی نمبر ۲۸، سیکٹر F-6/1، اسلام آباد۔

رسائل

ادا کار، ہفت روزہ، لاہور، ۱۰ تا ۱۶ اگست ۱۹۷۵ء

ادبیات، سہ ماہی، اسلام آباد، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء

افکارِ معلم، ماہ نامہ، لاہور

اوراق، ماہ نامہ، لاہور، جولائی اگست ۱۹۹۷ء، جنوری فروری ۱۹۹۸ء

خیابان، مجلہ شعبۂ اردو، پشاور یونی ورسٹی، پشاور، ۱۹۹۵ء

سیارہ، ماہ نامہ، لاہور، دسمبر ۱۹۹۱ء، جون جولائی ۲۰۰۰ء، دسمبر ۲۰۰۲ء

سیپ، ماہ نامہ، کراچی، شمارہ نمبر ۲۴، ۲۸، ۳۰

فنون، ماہ نامہ، لاہور، جولائی اگست ۱۹۷۵ء، دسمبر ۱۹۷۰ء، مئی اپریل ۱۹۷۲ء، جنوری فروری ۱۹۷۳ء، جولائی اگست ۱۹۷۳ء، دسمبر ۱۹۷۳ء، جولائی اگست ۱۹۷۵ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴ء، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء

قومی ڈائجسٹ، ماہ نامہ، لاہور، مارچ ۲۰۰۴ء

ماہِ نو، ماہ نامہ، لاہور، جنوری فروری ۱۹۸۸ء، اگست ۱۹۹۲ء، اکتوبر ۱۹۹۲ء

معاصر، سہ ماہی، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء تا مارچ ۲۰۰۸ء،

نقش، ماہ نامہ، کراچی، ۶-۵/۷۳

نقوش، ماہ نامہ، لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء، نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء